

# اصلاح معاشرہ اور تعمیرِ سیرت و اخلاق

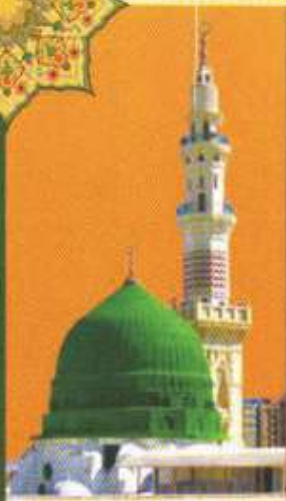


تالیف  
مولانا محمد اسحاق قاسمی ندوی  
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ اسلامیہ کراچی

وکیلہ مجازہ:  
عارف باللہ حضرت لانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمہ اللہ



دارالکتاب کراچی



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ سیرت و اخلاق



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# اصلاح معاشرہ

اور

## تعمیر سیرت و اخلاق

تالیف:

مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب

مہتمم و شیخ الحدیث

جامعہ عربیہ امدادیہ مراد آباد

و خلیفہ مجاز: عارف باللہ حضرت مولانا

شاہ حکیم محمد اختر صاحب مدظلہم

Mob`ile: 09412866177

ناشر:

مرکز الکوثر التعليمی والخیری

مراد آباد

اشاعت کی عام اجازت ہے۔

## تفصیلات

نام کتاب :	اصلاح معاشرہ اور تعمیر سیرت و اخلاق
تالیف :	مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب
طبع اول :	شیخ الحدیث جامعہ عربیہ امدادیہ مراد آباد ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۰۰۷ء
طبع دوم :	۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۱ء
طبع سوم :	ربیع الاول ۱۴۳۷ھ مطابق جنوری ۲۰۱۶ء
کمپیوٹنگ :	محمد اسجد قاسمی مظفر نگری
صفحات :	۱۶۰
باہتمام :	مرکز الکواثر التعليمی والخیری مراد آباد
ناشر :	فرید بک ڈپو دہلی
قیمت :	

### ملنے کے پتے:

جامعہ عربیہ امدادیہ مراد آباد یوپی  
فرید بک ڈپو دہلی  
کتب خانہ نعیمیہ دیوبند  
مکتبہ الفرقان لکھنؤ  
اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی  
مرکز دعوت و ارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی  
مولانا عبدالسلام خان قاسمی 179 کتاب مارکیٹ، وزیر بلڈنگ، بھنڈی بازار ممبئی



# مندرجات

- ۸ ..... مقدمہ (طبع سوم)
- ۹ ..... پیش گفتار
- ۱۰ ..... ☐ اپنی فکر میں لگے رہو
- ۱۴ ..... ☐ ٹی وی اور ڈش کے نقصانات
- ۱۷ ..... ☐ میں کے بجائے ”ہم“ مطلوب ہے
- ۲۲ ..... ☐ اتحاد اہم ترین ضرورت ہے
- ۲۵ ..... ☐ مغربی نظام معاشرت کی ابتری
- ۳۰ ..... ☐ مغرب کا دلفریب نعرہ: آزادی اور جدت
- ۳۴ ..... ☐ افراط اور غلو کی لعنت
- ۳۹ ..... ☐ احساس برتری اور احساس کہتری
- ۴۴ ..... ☐ بندہ مؤمن کے پانچ دشمن
- ۴۴ ..... ☐ (۱) جہادِ نفس:
- ۴۵ ..... ☐ (۲) شیطان سے جہاد:
- ۴۶ ..... ☐ (۳) کافروں سے جہاد:
- ۴۶ ..... ☐ (۴) منافقوں سے جہاد:
- ۴۷ ..... ☐ (۵) ظالموں اور فاسقوں سے جہاد:
- ۴۸ ..... ☐ سب سے بیش قیمت سرمایہ صالح افراد ہیں

- عصرِ حاضر کا شرک ----- ۵۱
- مادہ پرستی کا طوفان ----- ۵۳
- زاہد کے اوصاف ----- ۵۵
- (۱) قبر اور بوسیدگی کو فراموش نہ کرے: ----- ۵۶
- (۲) دنیوی زندگی کی عمدہ ترین آرائش کو چھوڑ دے: ----- ۵۷
- (۳) باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دے: ----- ۵۷
- (۴) اپنی زندگی کے اگلے دن کو شمار نہ کرے: ----- ۵۸
- (۵) اپنا شمارِ مردوں میں کرے: ----- ۵۸
- زبان کی حفاظت کی اہمیت ----- ۵۹
- قول و عمل کی ہم آہنگی ----- ۶۲
- قول و عمل ----- ۶۶
- خوفِ خدا کی اہمیت ----- ۶۹
- خدا ترسی ----- ۷۳
- دین پر جماؤ ----- ۷۶
- انسان کی ناشکری ----- ۷۹
- کامل انسان اور مکمل انسانیت ----- ۸۳
- تصنع و اسراف اور سادگی ----- ۸۹
- ایک بڑا فتنہ ----- ۹۲
- فوری طور پر ہمارے کرنے کے کام ----- ۹۶
- مال و اولاد کا فتنہ ----- ۹۹
- اپنی دنیا آپ پیدا کر ----- ۱۰۳

- ۱۰۸ ----- نعمتِ گویائی کا شکر مطلوب ہے ☐
- ۱۱۲ ----- دولتِ احساس و اخلاص ☐
- ۱۱۶ ----- انسانِ کامل ☐
- ۱۲۰ ----- موتِ سامانِ عبرت ہے ☐
- ۱۲۴ ----- نفسِ پرستی ☐
- ۱۲۸ ----- معصوم بچوں کو ظلم سے بچائیے! ☐
- ۱۳۱ ----- نفس کے گناہ اور ان سے بچاؤ! ☐
- ۱۳۲ ----- ○ (۱) سستی اور بزدلی: ☐
- ۱۳۲ ----- ○ (۲) کینہ اور بغض: ☐
- ۱۳۲ ----- ○ (۳) حرص و طمع: ☐
- ۱۳۵ ----- اجتماعیت کی روح ☐
- ۱۳۸ ----- اجتماعیت ☐
- ۱۴۱ ----- نیکیوں کا زہر؛ حسد ☐
- ۱۴۵ ----- نو جوانوں میں صحیح شعور پیدا کرنے کی ضرورت ☐
- ۱۵۰ ----- اخلاقی قوت ہی اصل جوہر ہے ☐
- ۱۵۴ ----- اعلیٰ انسانی کردار ☐
- ۱۵۸ ----- مصنف کی مطبوعہ علمی کاوشیں ☐





## مقدمہ (طبع سوم)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد !  
موجودہ پرفتن ماحول میں ہمارا مسلم معاشرہ انحراف اور بگاڑ کے دلدل میں پھنستا چلا جا رہا ہے، دینی شعور کے فقدان، صحیح تعلیم اور تربیت کی کمی، مخرب اخلاق چیزوں کے فروغ اور بے راہ روی نے ہمارے نوجوانوں کو بگاڑ کی آخری حد کے قریب پہنچا دیا ہے، اس صورت حال پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

یہ کتاب معاشرتی بگاڑ کی چو طرفہ چھائی ہوئی ظلمتوں میں صلاح اور اصلاح کا ایک دیا اور چراغ جلانے کی طالب علمانہ کوشش ہے، اور اس میں کم و بیش تمام ضروری موضوعات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن الحمد للہ مقبول ہوا، اب یہ دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے، راقم کوشش کے باوجود مصروفیات کی بنیاد پر اس میں حذف و اضافہ کا عمل انجام نہیں دے سکا، تاہم بحالت موجودہ بھی اس کی اشاعت انشاء اللہ افادیت کی حامل ہوگی۔  
خداوند قدوس اس کتاب کو قبول فرمائے، اور اسے راقم اور پورے معاشرہ کی اصلاح کا ذریعہ بنائے، آمین۔

محمد اسجد قاسمی، ندوی

خادم الحدیث النبوی الشریف جامعہ عربیہ اسلامیہ امدادیہ مراد آباد

یکم ربیع الاول ۱۴۳۷ھ، مطابق ۱۳ دسمبر ۲۰۱۵ء



# پیش گفتار

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين،

وعلى آله واصحابه اجمعين. اما بعد!

زیر نظر کتاب اصلاح معاشرہ اور تعمیر سیرت و اخلاق سے متعلق فکر انگیز مضامین کا پیش قیمت مجموعہ ہے، ان تمام مضامین میں قدر مشترک جذبہ اصلاح ہے، اور مقصد یہی ہے کہ خلق خدا ان کی روشنی میں اپنے روز و شب کا احتساب کرے اور جہاں جہاں بگاڑ در آیا ہے اسے دور کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جائے۔

ناچیز پر خداوند قدوس کے فضل کی انتہا نہیں کہ اس نے ٹوٹی پھوٹی ہی سہی زبان و قلم سے خدمت دین کی راہ پر لگا دیا ہے، اللہ اس میں خلوص کے رنگ بھر دے اور تاحیات یہ خدمت اپنی توفیق خاص سے لیتا رہے، حقیقت یہی ہے کہ ے

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

محمد اسجد قاسمی، ندوی

خادم الحديث النبوي الشريف جامعہ عربیہ امدادیہ مراد آباد

۱۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ



# اپنی فکر میں لگے رہو

قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ کے نصوص میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے کہ ہر انسان کو سب سے پہلے، سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کر اپنی اصلاح اور درستگی اور اپنی سیرت کی تعمیر پر توجہ دینی چاہئے، اس موضوع کی سب سے واضح آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ، إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ.

(المائدة: ۱۰۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنی ہی فکر میں لگے رہو، کوئی بھی گمراہ ہو جائے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں، جب کہ تم راہ پر چل رہے ہو، اللہ ہی کی طرف تم سب کی واپسی ہے، سو وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔

واضح فرمادیا گیا ہے کہ ہر وقت دوسرے کے اعمال کی برائیوں، دوسرے کے عقائد کی خرابیوں پر نظر رکھنے کے بجائے خود اپنے افعال و اعمال، کردار و سیرت، اخلاق و اقوال، افکار و خیالات کو خرابی اور برائی سے بچانے کی فکر و سعی ہونی چاہئے، انسان کو ہمہ وقت اپنی ذات کا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے کہ وہ خدا اور بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر انسان میں یہ احساس و فکر پیدا ہو جائے تو وہ کامیاب ہے، کسی کی گمراہی اس کے لئے شتمہ برابر بھی ضرر رساں نہیں ہو سکتی، آیت میں ہر فردِ بشر کو یہ حکم ہے کہ وہ دوسروں کی فکر میں حد سے زیادہ نہ گھلے، اپنی فکر مقدم رکھے، اپنے دین کے تقاضوں اور مطالبوں کو پورا کرے، ہر انسان سے اس کے اپنے اعمال و احوال ہی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

بقول مولانا دریا بادی:

”آیت میں ایک زبردست اصول یعنی شخصی ذمہ داری کا اثبات ہے اور ان لوگوں کا ابطال ہے جو انفرادیت کو اجتماعیت میں گم رکھنا چاہتے ہیں۔“ (تفسیر ماجدی: ۱/۹۷۹)

اسی مضمون کو دیگر آیات میں بھی واضح فرمایا گیا ہے، چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَأَنْ كَذَّبُواكَ فَقُلْ لِيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ، أَنْتُمْ بَرِيُّونَ مِمَّا  
أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيٌّ مِّمَّا تَعْمَلُونَ. (یونس/ ۴۱)

ترجمہ: اگر یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ، فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا  
حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ. (النور/ ۵۴)

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اللہ و رسول کے تابع فرمان بن کر رہو، لیکن اگر وہ رخ پھیر لیں تو وہ خوب سمجھ لیں کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کے ذمہ دار رسول ہیں، اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلُكُهُمْ. (مسلم شریف)

ترجمہ: جو یہ کہتا ہے کہ لوگ ہلاک و برباد ہو گئے وہ سب سے زیادہ ہلاک و برباد ہونے والا ہے۔

یعنی جس کا کام اپنے اعمال کی فکر کے بجائے محض دوسروں کی فکر، دوسروں پر تبصرہ، دوسروں کی حالت زار کا تذکرہ اور ہمہ وقت لوگوں کی تباہی و خرابی کا بیان ہو وہ خود سب سے بدتر حالت میں ہے، اسے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی اصلاح کی فکر پہلے کرنی چاہئے۔

سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں مولانا آزادؒ نے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے،  
لکھتے ہیں کہ:

”اگر لوگ گمراہ ہو جائیں تو ان کی گمراہی تمہارے لئے دلیل و حجت نہیں ہو سکتی کہ تم  
کہو! سب گمراہ ہو رہے ہیں تو اکیلی جان ہم کیا کریں، ہر آدمی پر ذمہ داری خود اس کے نفس  
کی ہے، دوسروں کے لئے وہ ذمہ دار نہیں، اگر ساری دنیا گمراہ ہو جائے جب بھی تمہیں حق پر  
قائم رہنا چاہئے۔“ (ترجمان القرآن: ۶۷۸/۲)

آیت کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی اصلاح کو مقدم کرے، یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں  
کی اصلاح کی فکر ہی نہ ہو، سیدنا صدیق اکبرؓ نے اسی کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ لوگو! تم یہ آیت  
پڑھ کر یہ سمجھتے ہو کہ دوسروں کی فکر بالکل نہ کی جائے، بس اپنی ہی فکر ہو، یہ غلط مطلب ہے،  
میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے  
کہ وہ برائی دیکھ کر اسے مٹانے کی اور ظالم کو ظلم کرتا دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے روکنے کی  
کوشش نہ کریں تو بعید نہیں کہ اللہ انہیں اپنے عذاب کی پلیٹ میں لے لے۔

معلوم ہوا کہ آیت کا منشا یہ ہے کہ اپنی اصلاح کا عمل مقدم ہو، پھر دوسروں کی اصلاح  
کا کام شروع کیا جائے، یہ ترتیب ملحوظ رہے گی تو اس کی تاثیر نمایاں ہو کر رہے گی، انبیاء، صحابہ  
وسلف کی تاریخ میں یہ ترتیب نمایاں نظر آتی ہے، انہوں نے جس چیز کا بھی حکم دیا سب سے  
پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا، دوسروں کی بقدر وسعت اصلاح مطالبات دین ہی کا حصہ  
ہے، آیت کا مقصود دوسروں کی اصلاح سے منع کرنا نہیں صرف اس کے مبالغہ آمیز تخیل میں  
اعتدال پیدا کرنا مقصود ہے۔

بقول مفسر دریا بادیؒ:

”مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کو اچھی بری بات بتاؤ نہیں، بلکہ یہ ہے کہ دوسروں کی  
عیب چینی اور کھوج میں نہ پڑے رہو، امر بالمعروف نہی عن المنکر تو بجائے خود ایک انفرادی

فریضہ ہے، اس کا سقوط مقصود نہیں، اسلام تو ایک اجتماعی دین ہے، جس میں فرد کے ساتھ ساتھ جماعت و ملت کی بھی اصلاح و فلاح مطلوب ہے، آیت کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ انسان جب یہ دیکھ لے کہ وعظ و پند مطلق کارگر نہیں ہوتا، بلکہ الٹا اس پر اور مضحکہ ہوتا ہے تو ایسے موقعہ پر چاہئے کہ سکوت سے کام لے اور بس اپنے ہی ذاتی اعمال کی فکر میں لگا رہے، مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہی طریقہ ہے عارفین سالکین کا کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر دینے کے بعد پھر کسی کے زیادہ درپے نہیں ہوتے۔“

(تفسیر ماجدی: ۱/۹۸۰)



# ٹی وی اور ڈش کے نقصانات

موجودہ حالات میں ٹی وی اور ڈش کے ذریعہ فحاشی اور عریانی کا جو طوفان ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اور اس کے مسموم اثرات سے ہر چھوٹا بڑا جس طرح متاثر ہے، اس کی زہرناکی سے واقفیت اور اس سے حفاظت پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔

فقہی تفصیلات سے قطع نظر اگر اخلاقی نقطہ نظر سے ڈش اور ٹی وی کے نقصانات کا تجزیہ کیا جائے تو ہر صاحب عقل یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ جنسی رجحانات کو مشتعل کرنے، اخلاق کو فاسد کرنے، حیا و غیرت کا خاتمہ کرنے، رذائل و فواحش کی ذہن سازی کرنے، اور نئی نسل کو مقصدیت اور تعمیر سے بے کاری اور تخریب کی راہ پر لے جانے کا سب سے اہم باعث ٹی وی اور ڈش کا طوفان ہے۔

سب سے بڑا نقصان ٹی وی اور ڈش کا یہ ہے کہ وہ مردوں کی غیرت کو ختم کر دیتا ہے، غیرت وہ امتیازی وصف محمود ہے جو اللہ ایک بندہ مؤمن میں راسخ دیکھنا چاہتا ہے، ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ انسان کی غیرت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دیوثیت آ جاتی ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بے غیرت و دیوث آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا، جنت اس کے لئے حرام ہے، ٹی وی اور ڈش کے فحش و عریاں پروگراموں، تصاویر و مناظر کو دیکھ کر غیرت و حمیت کا دامن تارتار ہو جاتا ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ خاص طور پر عورتوں کے اندر سے حیا ختم ہو جاتی ہے، ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ حیا و شرم ختم ہو کر اس کی جگہ بے حیائی و بے شرمی آ جاتی ہے، اور حدیث سے

معلوم ہوتا ہے کہ جب حیا ختم ہو جاتی ہے تو پھر آدمی سب کچھ کر سکتا ہے، اسلام میں حیا کا بہت اونچا مقام ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

”حیاء ایمان کا عظیم شعبہ ہے اور اعلیٰ اخلاق میں سے ہے۔“ (ابن ماجہ)

یہ بات بالکل مشاہد ہے کہ ڈش وٹی کے ذریعہ حیا ختم ہو جاتی ہے جس کے برے اثرات یہ ظاہر ہوتے ہیں کہ عورتوں میں بے حجابی آ جاتی ہے، پردہ بوجھ سمجھا جانے لگتا ہے، دوسرے ساتر لباسوں کا اہتمام باقی نہیں رہ جاتا، ٹی وی اور فلموں کے عریاں مناظر اور باریک لباسوں کی تقلید کا خیال جاگزیں ہو جاتا ہے، احادیث میں ان عورتوں کو مستحق لعنت اور جہنمی بتایا گیا ہے جو لباس ایسا پہنتی ہیں جن سے جسم جھلکتا ہے اور نظر آتا ہے، اور اعضاء ظاہر ہوتے ہیں۔

بے حیائی کے نتیجے میں خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز اٹھ جاتی ہے، اجنبی مردوں سے اختلاط معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے مہذب اور شائستہ عمل باور کیا جاتا ہے، اجنبی مردوں سے گفتگو کرتے وقت نزاکت اور نرمی ظاہر کی جاتی ہے، قرآنی احکام کی صریح خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں صراحۃً ازواجِ مطہرات کو بلا واسطہ اور تمام عورتوں کو بلا واسطہ حکم ہے کہ:

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ! لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ، إِنِ اتَّقَيْتُنَّ، فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا.

(الاحزاب/۳۲)

ترجمہ: اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔



یعنی لہجے میں کوئی لوچ نہ ہو، باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو، ایسا انداز نہ ہو جو مرد کے جذبات کو برا بیچتہ کر دے، مگر ٹی وی کے طوفانِ فحاشی نے اب عورتوں کو اس حکم قرآنی کی مخالفت کا عادی بنا دیا ہے، ڈش کے پروگرام دیکھنے اور سننے کی عادی خواتین میں اجنبی مردوں سے گھلنا ملنا، شور مچانا، ہنسی مذاق کچھ بھی معیوب نہیں رہتا۔

مزاج و طبع میں بے حیائی جب آجاتی ہے تو زبان سے بے حیائی کی باتیں بھی نکلتی ہیں، یہ ٹی وی اور ڈش کے نمایاں نقصانات میں سے ہے۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ جنسی و صنفی رجحانات میں ٹی وی و ڈش سے اشتعال پیدا ہوتا ہے، زنا اور فواحش کی قباحت دلوں سے نکل جاتی ہے، احادیث میں آیا ہے کہ نگاہ کا زنا دیکھنا ہے، یہ زنا تو ٹی وی اور ڈش کے ہر پروگرام کو دیکھنے والے سے سرزد ہوتا ہے، یہ زنا کا پہلا مرحلہ ہے جو آگے بڑھ کر زنا کے دوسرے مراحل تک متعدی ہوتا ہے۔

ماہرین کا یہ تجزیہ ہے کہ فلمیں جنسی رغبت میں اشتعال انگیزی کرتی ہیں اور معصوم و نوخیز بچوں اور بچیوں کے ذہنوں کو آلودہ اور مسموم کرتی ہیں، اور اس کے نتیجے میں بے شمار زنا کے واقعات پیش آتے ہیں۔

اس لحاظ سے ٹی وی، ڈش وغیرہ کا استعمال دینی و اخلاقی نقطہ نظر سے بہت مہلک اور ضرر رساں ہے، محض خبروں اور حالات کی آگاہی کے لئے ٹی وی وغیرہ کا استعمال بھی خطرناک ہے؛ کیونکہ اس کے ذریعہ بھی ان خطرناکیوں سے بچاؤ مشکل ہے جو ٹی وی کے ذریعے آتی ہیں، اس لئے انسانیت کا مفاد اسی میں ہے کہ ایسے آلات سے مکمل اجتناب کیا جائے، اور اپنی نئی نسل کو تخریب و بگاڑ کے بجائے تعمیر و مقصدیت کی راہ پر لگایا جائے۔



# میں کے بجائے ”ہم“ مطلوب ہے

عربی زبان کا لفظ ”انا“ (جو ”میں“ کے معنی میں آتا ہے) بہت ہی معروف و کثیر الاستعمال لفظ ہے جو واحد متکلم کے لئے بولا جاتا ہے، اور اسی سے انانیت کی اصطلاح بھی ماخوذ و مشتق ہے جو خود پسندی اور ذاتی مصلحت و منفعت پرستی اور مادہ پرستی وغیرہ معانی کے لئے استعمال ہوتی ہے، اس کے بالمقابل دوسرا لفظ ”نحن“ (جو ”ہم“ کے معنی میں آتا ہے) جو جمع متکلم کے لئے ہے، اور انانیت کے مقابلہ میں ”فحیت“ کی اصطلاح اس سے اخذ کی جاسکتی ہے جس کا اطلاق اجتماعیت، تعاون ملی، قومی منفعت کی ترجیح وغیرہ معانی پر ہو سکے۔

پسماندہ، اخلاق سے منحرف اور مائل بہ زوال اقوام پر انانیت کا احساس غالب رہتا ہے جب کہ ترقی یافتہ، بااخلاق، زندہ و سرگرم اقوام پر اجتماعی و قومی شعور اور قومی ترقی و بلندی کی فکر کا رجحان غالب رہتا ہے، جس طرح ہر انسان انانیت اور اجتماعیت دونوں طرح کے احساسات کا حامل رہتا ہے لیکن کچھ افراد پر انانیت کا احساس اس طرح سے غالب رہتا ہے کہ ان کی ہر نقل و حرکت اور قول و عمل کا اصل محور و مرکز اور دار و مدار خود پسندی و انانیت پر رہتا ہے، اور دیگر کچھ افراد پر اجتماعی و قومی احساس کا غلبہ رہتا ہے، اور وہ ہمیشہ قومی مفاد، عوامی فلاح و صلاح ہی کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں، جب کہ کچھ افراد کا معاملہ درمیانی ہوتا ہے، ان کی عملی سرگرمیوں میں انانیت اور اجتماعیت دونوں عناصر یکساں طور پر ملتے ہیں، یہی حال اقوام و امم کا بھی ہوتا ہے، کسی قوم پر انانیت، اور کسی پر اجتماعیت غالب رہتی ہے جب کہ کچھ قومیں درمیانی معاملہ رکھتی ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کچھ جگہوں پر ذاتی و انفرادی ملکیت کا خوب احترام و لحاظ ملتا ہے مگر قومی و عوامی ملکیت کا برائے نام بھی احترام نہیں ملتا، سڑک اور روڈ پوری قوم کی ملکیت ہے، مگر بہت سے مقامات پر اسے ذاتی چیز سمجھ کر اس پر گندگیوں اور غلاظتوں کا انبار پھینک دیا جاتا ہے، یہ انانیت و خود پسندی کے غلبہ اور اجتماعی احساس کے فقدان کی ایک معمولی مثال ہے، جب کہ دوسرے مقامات پر ایسا نہیں ہوتا، بلکہ سڑکوں کو قومی چیز سمجھ کر اس کی صفائی کا اہتمام ہوتا ہے اور اسے گندگی سے دور رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔

شیخ محمد عبدہ کا یہ واقعہ منقول ہے کہ ایک بار وہ سفر پر تھے، ان کے رفیق سفر نے راستہ کے کسی درخت سے گلاب کا پھول توڑ لیا، یہ منظر دیکھ کر شیخ رونے لگے، سبب دریافت کیا گیا تو بتایا کہ میں نے ایک انگریز عورت کو دیکھا کہ دوران سفر اس کا چھوٹا بچہ راستہ سے گلاب توڑنے چلا تو اس نے بچہ کو روکا اور سختی سے ڈانٹا اور یہ کہا کہ یہ پھول ہر مسافر کی ملکیت ہے، یہ تنہا تمہاری ملکیت نہیں ہے، اسے باقی رہنا چاہئے تاکہ آج کے اور کل کے اور اسکے بعد کے مسافر اس کی خوشبو اور رونق سے لطف اندوز ہو سکیں، شیخ نے کہا کہ افسوس اور رونا اس کا ہے کہ ہم پر انانیت کا غلبہ ہے اور ہم اجتماعی اور مفاد عام کے احساس سے نا آشنا ہیں۔

انانیت پسندوں کی طرف سے نیک کاموں میں، غریب محتاج کے تعاون میں بھی انانیت و خود پسندی کا مظاہرہ ہوتا ہے، ان کی جیب سے پیسہ جب ہی نکلتا ہے جب فقیر بالکل جم اور چمٹ جائے اور واپسی پر کسی صورت آمادہ ہی نہ ہو، اور پھر جب پیسہ نکل بھی جاتا ہے تو وہ اپنی انا کی تسکین اور ریاکاری کے مقصد سے سب کے سامنے برسر عام فقیر کے ہاتھ میں تکبر کے انداز میں دیتے ہیں، ان کی یہ ساری حرکتیں ان کی انانیت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جب کہ اجتماعی کا احساس رکھنے والے افراد بڑی تواضع و ہمدردی کے ساتھ نوع انسانی کے ہر واقعی ضرورت مند کے لئے دل گیر ہوتے ہیں اور حسب المقدور تعاون کرتے کراتے ہیں

اور مستقل کوشاں رہتے ہیں اور سب کچھ اپنا حق لازم سمجھ کر انجام دیتے ہیں، دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔

عالمی طور پر اقوام کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انسانیت پسند افراد بے پناہ ہیں، اور اجتماعی شعور کے حاملین خال خال ہیں، بگاڑ کا عام ہونا اور صلاح و فلاح کا کم یاب ہونا اس کا واضح ثبوت ہے، ظالموں کا معصوموں و بے قصوروں کو نشانہ بنانا اسی وجہ سے ہے، موجودہ عالمی منظر نامے میں امریکہ کا افغانستان کو تباہ کرنے کے بعد عراق پر حملہ آور ہونا اور پٹروں کی دولت پر مکمل تسلط کے ارادہ سے جنگ چھیڑنا اسی خود پسندی کی فکر کا واضح اور تازہ مظہر ہے، اور عرب و غیر عرب ممالک کی امریکہ کی خاموش تائید و حمایت اور عراق کی مدد و تعاون سے دریغ اور اس طرح حق کی مدد نہ کر کے باطل کی خاموش تائید اور اس کے سامنے سپر اندازی کا بھی اصل سبب اپنے اقتدار و ذاتی مفادات کا تحفظ ہے جو خود پسندی کے سوا اور کچھ نہیں، فلسطین کے مظلوموں کے حق میں عملی اقدامات پر قدرت اور اتحادی گروہ کی تشکیل کے ذریعہ اسرائیلی جارحیت کے سد باب کی استطاعت کے باوجود عرب حکمرانوں کا پس و پیش اور اپنے اقتدار میں مست و غرق رہنا بھی اپنے مفادات کی حفاظت اور قربانیوں و مشکلات کا تحمل کرنے کے جذبہ سے محرومی کی بنیاد پر ہے جو ان کی انسانیت کی کھلی دلیل ہے۔

یوں تو ہر فرد بشر کے مزاج میں اجتماعی احساس انفرادی شعور پر غالب رہنا چاہئے کہ یہی انسانیت کی حقیقی روح ہے، لیکن اہل اسلام جو ابدی و سرمدی دین کے حامل اور علم بردار ہیں، ان کا یہ دینی و مذہبی، اخلاقی و عقلی فرض ہے کہ وہ سب سے آگے بڑھ کر اجتماعی احساس کو بیدار و غالب کریں، ان کے دل کی ہر دھڑکن اور دماغ کی ہر فکر اور جسم و اعضاء کی ہر نقل و حرکت اور ہر قول و عمل، بلکہ گفتار و رفتار سب اسی جذبہ سے سرشار ہو۔

ان کی روشن تاریخ کا ہر صفحہ اس جذبہ سے سرشار افراد کی عملی سرگرمیوں سے بھرا ہوا

ہے، پوری اسلامی تاریخ اجتماعی احساسات کے تحت اہل اسلام کی پیش کردہ قربانیوں سے منور ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حد سے زیادہ سادہ زندگی صرف اسی لئے گذاری کہ آرام و راحت پہلے ان کی سب رعایا کو میسر آجائے، واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار کھانا کھا رہے تھے، اسی دوران عتبہ بن ابی فرقہ آئے، حضرت عمرؓ کے کہنے پر عتبہ کھانے میں شریک ہوئے، کھانا اتنا موٹا تھا کہ عتبہ سے نگلا نہیں جا رہا تھا، انہوں نے عرض کیا اے امیر المؤمنین! بہتر ہو کہ آپ چھنا ہوا آٹا استعمال کریں، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کیا سب مسلمانوں کو چھنا ہوا آٹا دستیاب ہے، عتبہ نے کہا نہیں سب کو تو میسر نہیں ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمام لذتیں دنیا ہی میں حاصل کر لوں۔

یہ واقعہ ان کے ایثار، خوف آخرت، اجتماعیت کے احساس و شعور کا اور ذاتی مصلحت و منفعت کے حصول سے یکسر دوری اور بیزاری کا ثبوت ہے، حضرت عثمانؓ نے قحط کے عالم میں دسیوں اونٹوں پر لدا ہوا غلہ جو بہت نفع کے ساتھ فروخت ہو سکتا تھا، مفت لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا، تمام صحابہ نے ہر موقع پر دوسروں کا تعاون کیا، دوسروں کے نفع کو مقدم رکھا، دوسروں کے بھلے کے لئے اپنا ذاتی نقصان گوارا کیا، اسی وصف امتیازی کا ذکر قرآن نے کیا کہ:

وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. (الحشر/۹)

ترجمہ: وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود اپنی جگہ کتنے

ہی محتاج کیوں نہ ہوں۔

یہ سب ان کے اجتماعی شعور کی دلیل ہے، صحابہ اور اسلاف امت کے ایثار و اجتماعیت کے شعور کے بے شمار نمونے تاریخ میں محفوظ اور لائق تقلید ہیں۔

اہل اسلام اور موجودہ حالات میں خاص طور پر اہل عرب اور ان میں بطور خاص عرب حکمرانوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کرنی ہوگی کہ جب تک انسانیت کی جگہ اجتماعی شعور بیدار نہیں

ہوگا، جب تک ایثار و قربانی کا جوہر نہیں پیدا ہوگا، اور جب تک ذاتی مادی اور حقیر مقاصد و مصالح سے دست بردار ہو کر قومی و ملی مصالح کو اولین اہمیت نہیں دی جائے گی یوں ہی تباہی آتی رہے گی، اغیار ظلم کرتے رہیں گے، پسپائی اور دباؤ میں رہنا پڑے گا، یہ واقعہ ہے کہ حق کے مقدر میں سر بلندی اور غلبہ ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ حق پر ہونے کا دعویٰ کرنے والے مطلوبہ اوصاف کے حامل ہوں، اس وقت کامیابی کے لئے کلیدی اہمیت اس کی ہے کہ انسانیت کی جگہ اجتماعیت و ایثار پیدا ہو اور ”میں“ کے بجائے ”ہم“ کی فکر عام ہو۔



# اتحاد اہم ترین ضرورت ہے

احادیثِ نبویہ کے ذخیرے میں امتِ محمدیہ کے باہمی اختلاف و انتشار کی پیشین گوئیاں جا بجا نظر آتی ہیں، اس موضوع کی سب سے مشہور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم محمد ربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً، وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً، كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً. (ابوداؤد)

ترجمہ: یہود و نصاریٰ ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے، میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ کر رہے گی۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ ”سوائے ایک فرقے کے سب جہنم میں جائیں گے۔“

مسائل و عقائد اور دینی افکار کے اختلافات تو شروع سے چلے آرہے ہیں اور روز بروز بڑھ رہے ہیں، اس کے علاوہ ملی و ملکی، قومی و اجتماعی مسائل میں بھی امت کا مختلف ٹولیوں میں بکھراؤ اور ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونا اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مرض، ان کی واضح شناخت، اغیار کے لئے سنہری موقعہ اور مسلمانوں کے زوال و ادبار کا اصل سبب ہے، قرآن کریم میں ایک طرف قرآن کو مضبوطی سے پکڑنے اور ہر شعبہ زندگی میں اس پر عمل کرنے کا حکم ہے، دوسری طرف تفرقہ بازی سے بچنے کا حکم ہے، اس طرح یہ اشارہ کر دیا گیا ہے کہ قرآن پر عمل کے نتیجہ میں اتحاد آتا ہے اور انتشار جاتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اختلاف سب سے مہلک مرض ہے، اسی لئے اسلام اپنے حاملین کو ہر

طرح سے اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے، اختلاف کی مذمتوں اور اتحاد کے فوائد کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہے، احادیث میں اختلاف کو سبب ہلاکت بتایا گیا ہے، سابقہ امتوں کی تباہی اور بربادی کا ایک اہم سبب اختلاف بھی تھا۔

تفرقہ و اختلاف کا وجود لازمی ہے، اس کا ذکر حدیث میں ملتا ہے ”حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین دعائیں کیں، دو دعائیں قبول کر لی گئیں، ایک دعا قبول نہ ہوئی، میں نے اللہ سے یہ دعا کی کہ میری امت کو قحط عام میں ہلاک نہ کرے، دوسری دعا یہ کہ میری امت غرق آب ہو کر نہ ہلاک ہو، یہ دونوں دعائیں قبول ہو گئیں، تیسری دعا یہ کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے نہ لڑیں، اللہ نے یہ دعا قبول نہیں کی“۔ (مسلم شریف)

اسلاف امت اختلاف کو کتنا خطرناک سمجھتے اور دور بھاگتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائی، قصر کی رخصت پر عمل نہ کیا تو اس پر صحابہ میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں، حضرت عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ میں نے منیٰ میں دو رکعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی پڑھیں اور حضرت ابو بکر و عمر کے پیچھے بھی، اب حضرت عثمان دو کے بجائے چار پڑھا رہے ہیں، لیکن پھر ابن مسعود نے چار رکعت پڑھ لی اور فرمایا کہ اختلاف سے شر پیدا ہوگا، اس شر سے بچنے کے لئے دو کے بجائے چار رکعات پڑھ لی۔ (ابوداؤد شریف)

قرآن بتاتے ہیں کہ ابن مسعود کا نقطہ نظر دو رکعت کے استحباب و افضلیت کا تھا مگر چار کے اتمام کو بھی وہ جائز سمجھتے تھے، اگر قصر واجب ہوتا تو وہ چار رکعت نہ پڑھتے، اس واقعہ سے یہ اصولی ضابطہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دفع مفاسد حصول مصالح پر مقدم ہے، حضرت ابن مسعود نے اختلاف کے مفسدہ کو دفع کرنے کے مقصد کو اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحت کے حصول پر مقدم رکھا۔

اختلاف پیدا ہونے کے اسباب متعدد ہوتے ہیں، جن میں خواہش پرستی، جہالت،



بے خبری، دل کی کجی، دماغ کی عدم سلامتی، نااہلوں سے حصول علم اور ان کی ہم نشینی، ناسمجھی، تشددِ بیجا، اعتدال سے دوری، بدعت، تعصب، غیروں کے افکار سے بے انتہا مرعوبیت و تاثر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ سے سستی وغیرہ شامل ہیں۔

اختلاف کو ختم کرنے اور اتحاد لانے کے بہت سے ذرائع و اسباب ہیں، سب سے اصل و مقدم سبب کتاب و سنت کا زندگیوں میں عملی نفاذ اور مضبوطی سے تھام لینا ہے، سلف صالح کے طریقہ کی پیروی، تفقہ فی الدین بھی اہم اسباب ہیں، علمائے حق سے رابطہ اور تعلق و مجالست، خدمت و تعظیم بھی اتحاد کا باعث ہے، علماء کو حدیث میں خیر کی کنجی اور شر کا سد باب کرنے والا قرار دیا گیا ہے، فتنوں کے ہجوم میں علمائے حق کی قربانیاں اور ثابت قدمی ہی مقابلہ کرتی ہیں۔ فتنہ ارتداد کے موقع پر حضرت ابو بکرؓ کی بے مثال ثابت قدمی اور فتنہ خلق قرآن کے موقع پر حضرت امام احمد بن حنبلؓ کی استقامت نے دین حق کو غلبہ و سر بلندی عطا کی تھی۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ فتنوں کے عالم میں جب ہم پر شدید خوف طاری ہو جاتا تھا اور زمین تنگ معلوم ہونے لگتی تھی تب ہم شیخ ابن تیمیہ کے پاس آتے تھے اور ان کو دیکھتے ہی اور ان کی بات سنتے ہی سارا خوف چلا جاتا تھا اور سارا غم ختم ہو جاتا تھا۔ (الوابل الصیب/ ۷۹)

جب تک ہر فرد پوری قوم کی اجتماعیت اور اپنی اور سب کی اصلاح کی فکر نہیں کرے گا، جب تک جزئی و فروعی امور میں سو قیانہ اور غیر مہذب اختلاف ختم نہیں کیا جائے گا اور جب تک ہر نوع کے تعصب کو ٹھکرایا اور فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ادا نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اتحاد ایک خواب رہے گا اور شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اتحاد کا وجود دینی پختگی اور صلابت پر منحصر ہے، دینی صلابت کا فقدان موجودہ اختلاف کی بنیادی وجہ ہے، تحریکات، تنظیمات، مضامین و مواعظ کبھی اتحاد پیدا نہیں کر سکتے اگر عملی جذبہ افراد امت میں نہ پیدا ہو سکے۔



# مغربی نظام معاشرت کی ابتری

موجودہ دور میں عزت و ذلت، بلندی و پستی اور شرافت و رذالت کے تصورات اور معیار بالکل الٹ کر رہ گئے ہیں، حقائق کو مسخ کرنے اور سچائی کو مشتبہ کرنے کا جو کام عصر حاضر کے نام نہاد ترقی پسندوں کی وجہ سے ہوا ہے وہ تاریخ عالم کا ایسا تاریک ترین اور شرمناک باب ہے جس کے سامنے تمام سیاہیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔

اس کا ایک نمایاں مظہر یہ بھی ہے کہ بے شمار مشرقی مسلم خواتین کا اس وقت یہ تصور اور خیال ہے کہ مغرب میں خواتین کو معاشرے میں نمایاں ترین مقام حاصل ہے، آزادی کی دولت بے بہا میسر ہے، تمام حقوق ملے ہوئے ہیں، تمام شعبہ ہائے حیات میں ان کے کارنامے ہیں، ہر مرحلے پر ان کا اہم رول ہے، اور زندگی کی تمام نعمتوں اور رونقوں سے وہ مالا مال ہیں، مشرقی خواتین کا مغربی خواتین کے بارے میں یہ تصور دراصل مشاہدہ و تجربہ نہیں؛ بلکہ میڈیا کی فراہم کردہ اطلاعات، خبر رسائیوں، منظر کشی اور پروگراموں پر مبنی ہے، میڈیا کے ذریعہ آزادی نسواں کی پر فریب صدا عرصہ دراز سے لگائی جاتی رہی ہے، اور آزادی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد اور مغربی خواتین کی پر عیش زندگی کے نمونے مختلف شکلوں میں سنائے، دکھائے اور پیش کئے جاتے ہیں، مختلف عالمی تنظیموں اور تحریکوں کی طرف سے مساوات مرد و زن کی صدا بھی لگائی جاتی ہے۔

مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان خواتین تہذیب مغرب کی تجلیات میں خیرہ ہو کر اسی کی پیرو بن جائیں اور اسلامی اعلیٰ اقدار و اخلاق سے دستکش ہو جائیں، اپنی مذہبی و تہذیبی ذمہ

داریوں سے غافل ہو جائیں، اپنے فطری کاموں اور فرائض کو چھوڑ کر یورپ کی بے حجابانہ اور عریاں آزادی کے حصول کے لئے پوری طرح سے سرگرم ہو جائیں، اس طرح ان کی پاکیزگی داغدار ہو جائے، ان کی عزت کی چادر تار تار ہو جائے، ان کی کرامت و شرافت گدلی ہو جائے، بے حجابی اور مختلط ماحول کے اثرات سے ان کے دیدوں کا پانی اتر جائے، وہ حیا چھوڑ کر بے حیائی کو اختیار کر لیں، اور خواہش پرست انسانوں کے دام فریب میں آجائیں اور انہیں کا نشانہ بن جائیں اور اس طرح اپنے دین و مذہب سے مکمل بے گانہ و بیزار ہو کر یورپین کلچر میں اس طرح ضم (Mix) ہو جائیں کہ اسلام کا کوئی اثر ان کے کردار، باطن، سیرت اور صورت و ظاہر اور قول و عمل میں نظر ہی نہ آئے، اور پھر یہ سب کچھ وہ اس طرح کریں کہ وہ اپنے کو ذلت سے نکل کر عزت میں اور پستی و رذالت سے نکل کر بلندی و شرافت میں آنے والا باور کریں اور ان کے ذہنوں میں یہ راسخ ہو چکا ہو کہ اسلام میں عزت و شرافت نہیں، وہ دقیانوسی، رجعت پسند، شدت پسند اور آؤٹ آف ڈیٹ مذہب ہے جب کہ مغربی کلچر میں عزت و شرافت ہے، بلندی و کمال ہے اور وہ ہر لحاظ سے نئے دور سے ہم آہنگ ہے، فطری تقاضوں کے موافق ہے، اپ ٹو ڈیٹ ہے، اور اس میں تمام مشکلات کا حل اور تمام مسائل کا مدوا ہے، ظاہر ہے کہ جب تصورات اس رخ پر آجائیں کہ حقائق منخ ہو جائیں اور معیار عزت و ذلت معکوس ہو جائے تو پھر درستگی اور اصلاح کے چانسز بیکدم ہو جاتے ہیں۔

مغربی میڈیا اپنے ان مقاصد میں کافی کامیاب بھی ہوا ہے، بے شمار مشرقی گھرانوں میں اس نے شب خون مارے ہیں، کج فکر اور بے حجابانہ آزادی کے طالب اور دین سے محروم افراد اس کا نشانہ بنے ہیں، مشرقی خواتین مغربی خواتین کے شانہ بہ شانہ ہر کام میں شریک ہوئیں، آزادی کی تلاش میں ان کا دامن عصمت تار تار ہوا، وہ نشہ آور اشیاء کی عادی ہوئیں، وہ اخلاق سے عاری ہوئیں، ماڈی زیب و زینت اور چمک دمک نے ان کو اپنا اسیر بنایا، اس طرح وہ ذلت اور پستی کی آخری حدوں کو جا پہنچیں، اور پھر ان میں بہتوں کو اپنی نادانی کا

احساس بھی ہوا اور پھر وہ راہِ راست پر آئیں۔

مشہور اسلامی مفکر واسکا لریڈا کٹر مصطفیٰ سباعی نے اپنی کتاب ”الْمَرَأَةُ بَيْنَ الْفِقْهِ

وَالْقَانُونِ“ میں اپنے الم ناک مشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”میں نے یورپ کا چار بار دورہ کیا ہے، اور ہر بار مجھے سب سے زیادہ دکھ اور رونا اس پر آیا کہ مغربی عورت بڑی حرماں نصیبی کی زندگی گزار رہی ہے، آزادی کے نام پر اسے رسوا کیا جا رہا ہے، وہ ہر ایک کے لئے نوالہ تر بنی ہوئی ہے، مغربی مرد عورت کی کمزوری کی قیمت وصول کر رہا ہے، اسے ہر طرح ذلیل کر رہا ہے، اس کا استحصال ہو رہا ہے، مادی منافع اور جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے عورتیں استعمال کی جا رہی ہیں، سینما، ٹی وی، کلرڈ میگزین اور نمائشوں اور ان میں مغربی خواتین کا رول دیکھ کر جو لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسے آزادی اور بلندیِ باور کرتے ہیں، درحقیقت وہ بہت کوتاہ بین ہیں، اگر یورپ میں دس عورتیں اونچے مناصب پر فائز اور بلند مرتبہ ہیں تو دوسری طرف وہیں دسیوں ملین عورتیں غلاموں جیسی پابند اور ذلیلانہ شرمناک زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔“

وہاں کے معاشی تنگ حالات نے عورتوں کو مختلف شعبوں میں مختلف سطحوں پر

ملازمت اور کام کرنے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سباعی لکھتے ہیں:

”لڑکی جب سترہ سال کی ہو جاتی ہے تو عموماً اس کے باپ اور اہل خانہ اس کے مصارف برداشت کرنے کے پابند نہیں ہوتے؛ بلکہ اسے خود اپنے لئے کام ڈھونڈنا پڑتا ہے، شادی کے بعد اسے اپنے گھر اور بچوں کی کفالت کے لئے شوہر کی طرح ملازمت کرنی پڑتی ہے، بڑھاپے میں ناتوانی کے باوجود اسے اپنے گزارہ کے لئے کام کرنا پڑتا ہے، اس کے بیٹے خواہ کتنے ہی مالدار اور صاحب ثروت کیوں نہ ہوں اس کا خرچ بالکل نہیں سنبھالتے۔“

اس ابتر صورتحال کے اصل سبب کا ذکر کرتے ہوئے شیخ سباعی نے لکھا ہے کہ:

”اس مادی فلسفہ کا سب سے اہم سبب اور اثر یہ ہے کہ وہاں عورتوں کے تئیں انسانیت، اکرام، محبت اور موڈت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، وہاں عورتوں کو صرف تکمیلِ شہوات کا ذریعہ باور کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ اولاد کی صحیح تربیت ہے، اور نہ اولاد

کے نزدیک والدین کا احترام، بلکہ پورا خاندانی نظام مفلوج و منتشر ہے، صورتحال ہر لحاظ سے قابل تشویش ہے۔

امریکہ کے بعض اداروں نے یہ سروے بھی کرایا ہے کہ کتنی خواتین ملازمت کرنا چاہتی ہیں، اور کتنی خواتین ملازمت چھوڑ کر اپنی خانگی و داخلی ذمہ داریاں نبھانا چاہتی ہیں؟ محتاط اندازہ کے مطابق امریکہ کی ۶۵ فیصد خواتین ملازمت سے تنگ ہیں، وہ مجبوراً ملازمت کر رہی ہیں اور ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ وہ ملازمت کی ذلت سے خلاصی حاصل کر کے خانگی کام سنبھالیں۔

اس صورتِ حال کے پس منظر میں مشرقی مسلم خواتین کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کو اپنی آخری پناہ گاہ سمجھیں اور یہ یقین کر لیں کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تہذیب انہیں وہ بلندی، رفعت، حیا، پاکدامنی، عزت، کرامت و شرافت، تقدس اور اخلاقی قوت نہیں دے سکتی جو اسلام نے ان کو عطا کی ہے۔

دعوتی کام کرنے والوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی ان مقدس تعلیمات سے خواتین کو روشناس کرائیں جن میں خواتین کے حقوق کا ذکر ہے، اور مغربی تہذیب کے نقصانات سے بھی آگاہ کرائیں۔

اسلام کا خاندانی نظام معاشرت اگر پوری طرح سے اپنایا جائے تو تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں، اسلامی نظام معاشرت اور مغربی نظام معاشرت کا سب سے واضح فرق یہی ہے کہ مغرب میں خاندانی نظام ٹوٹ رہا ہے، منتشر ہو رہا ہے، میاں بیوی میں اعتماد و محبت کا فقدان ہے، مغربی مفکرین و فلاسفہ مضطرب ہیں کہ مغربی معاشرتی نظام کس تدبیر سے بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچ سکتا ہے۔

جب کہ اسلامی نظام معاشرت اتحاد، اعتماد، محبت اور خوفِ خدا کی ناقابل شکست بنیادوں پر استوار ہے جسے کبھی توڑا اور بکھیرا نہیں جاسکتا، خواتین اسلامی سوسائٹی کی عظیم رکن اور مؤثر

وفعال عضو ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا سایہ بھی اپنے اوپر نہ پڑنے دیں، خواتین فضائل بشری میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں، دینی معاملات میں وہ مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں، ہر جگہ ان کی خدمات ہیں، علم و ادب، حدیث و تفسیر، جہاد و استقامت ہر میدان میں ان کے قابل رشک کارنامے ہیں، اللہ کی رحمت و بخشش میں بھی کامل مساوات ہے، وہاں مرد و زن میں تفاوت نہیں ہے۔

اس وقت ضرورت اسلامی نظام معاشرت کو عام کرنے اور مغربی نظام کا بائیکاٹ کرنے کی ہے، مغربی نظام زندگی کی حقیقی لذت و سرور و سکون سے خالی اور محروم ہے، وہاں تیز رفتار ترقیات ضرور ہوئی ہیں، محیر العقول سائنسی کارنامے ضرور ہیں مگر اپنی زندگی اور خاندان میں کوئی اصلاح اور سدھاراں سے نہ ہوسکا بقول اقبال:۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا  
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا

اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا

آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا



# مغرب کا دلفریب نعرہ:

## آزادی اور جدت

کسی بھی معاشرہ کے بگاڑ اور زوال کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی قدروں، اصول اور طریقہ کار کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی در یوزہ گری کرے، اور اپنی سماجی و مذہبی خصوصیات و امتیازات سے دستکش ہو کر دوسرے سماجوں اور تہذیبوں کی چاکری کرے۔

ازدواجی زندگی کا جو تصور اسلام نے دیا ہے وہ مغرب کے وضع کردہ قوانین سے یکسر مختلف ہے، مغربی اصول میں جنسی، نسلی اور قومی فرق اور بھید بھاؤ کو بنیادی درجہ دیا گیا ہے، وہاں کالے گورے کا فرق ہے اور گوروں کو کالوں سے بلند مرتبہ قرار دیا جاتا ہے وہاں مرد و زن کی مساوات کا جو نعرہ لگایا جاتا ہے اس میں حقوقِ نسواں کا اعلان بھی بڑے شد و مد سے کیا جاتا ہے، اہل مغرب زندگی کے ہر شعبہ میں عورت کو مرد کی صف میں مساویانہ کھڑا کرتے ہیں اور اسے اپنا تہذیبی امتیاز قرار دیتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ صدیوں کی غلامی کے بعد انہوں نے عورتوں کو آزادی دلادی ہے، اور اب عورتوں کے آلام و مصائب کا دور ختم ہو چکا ہے۔

ان دلفریب نعروں کا عورتوں نے استقبال کیا اور متاثر ہو کر اپنا وقار اور حیا تار تار کر کے میدان میں آگئیں اور اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار باور کیا، لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو آزادیِ نسواں کے نام پر کئے جانے والے پروپیگنڈہ کا فراڈ کھل کر سامنے آتا ہے کہ ان مغربی ممالک میں تمام تر گھٹیا اور نچلے کام عورت کے سپرد ہیں اور بلند عہدوں تک

رسائی ان میں سے ایک فیصد کی بھی نہیں ہے۔

تہذیب حاضر کی ہر کل ٹیڑھی ہے، عورت اپنے اہل خانہ کی خدمت کر لے تو یہ دقیانوسیت اور رجعت پسندی قرار پائے مگر وہی عورت اگر برسر عام ہوٹلوں میں، ہوائی جہازوں میں، پبلک دکانوں میں ویٹر، روم اسٹنڈنٹ، ایئر ہسٹس اور سیلنگرل بن کر خدمت کرے اور لوگوں کی ہوسناک نگاہوں کا ہدف بنے تو یہ آزادی ہے، جدت و اعزاز ہے۔

ماں ساٹھ سال سے زیادہ عمر کو پہنچ جائے تو اسے معذورین کے لئے موجود خاص مکان میں منتقل کر دیا جاتا ہے، نسیمیں اس کی دیکھ بھال کرتی ہیں، بیچہ ماں محبت، خلوص اور بے غرض خدمت سے محروم ہو جاتی ہے، وہ کس مہر سی اور بے چارگی کا شکار ہو کر موت کی منتظر رہتی ہے، کسی بیماری کا شکار ہو جانے پر اسے ہسپتال میں ہی شفٹ کر دیا جاتا ہے اور ہسپتال کا عملہ دیکھ رکھ کرتا ہے، اولاد کی ذمہ داری صرف مصارف ادا کرنے کی ہی رہ جاتی ہے، غرض یہ کہ مغربی نظام نے آزادی، جدت اور مساوات کے نام پر پورا فیملی سسٹم تباہ کر دیا ہے، اسلامی خاندانی امتیازات کی خالصیت پر تیشے چلانے کی کوشش کی ہے۔

اسی مغربی نظام اور پروپیگنڈہ کی کشش ہے کہ زنا عام ہو رہا ہے، زن و شو کے تعلقات بگڑ رہے ہیں، خواتین ماں بننے سے گریزاں ہیں اور پورا معاشرہ بے حیائی کی آخری حدیں چھو رہا ہے، تبادلہ ازواج کی بدترین رسم بھی جاری ہے، غیر قانونی بچے بڑھتے جا رہے ہیں، ناجائز رشتے بڑھتے جا رہے ہیں، خواہش نفس کی ہر طرح تکمیل کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ مغرب زدہ افراد اپنے نظام کی تمام تر خرابیوں اور مفاسد کا اندازہ کرنے کے باوجود بھی اسلام مخالف حرکتوں سے باز نہیں آ رہے ہیں اور جگہ جگہ یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو قید کر دیا ہے، اسلام میں خواتین کا کوئی احترام نہیں، مساوات نہیں، وہاں عورتوں کو سیکنڈ پوزیشن دی گئی ہے اور بہت بڑا ظلم کیا گیا ہے۔



جب کہ اسلام نے تمام شعبہ ہائے زندگی میں جو جامع، متوازن اور معتدل اصول تیار کئے ہیں ان کی تقلید ہی ہر مرض کا علاج اور ہر نقصان کی تلافی اور ہر بگاڑ کی اصلاح کا کام کر سکتی ہے، اسلام نے عورت کو جو عزت اور مرتبت عطا کی ہے وہ بے نظیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي.

ترجمہ: تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لئے بہتر ہو، اور میں تم میں اپنے اہل و عیال کے حق میں سب سے بہتر ہوں۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خواتین کی عزت شریف ہی کرتا ہے اور بے عزتی رذیل ہی شخص کرتا ہے۔

اسلام میں نکاح و شادی ایک پاکیزہ بندھن ہے، جس میں محبت، ہمدردی، پاکدامنی، پاکیزگی، صالح معاشرہ کی تشکیل، معتدل ترین خاندان کی تعمیر، اسلامی خطوط پر تعلیم و تربیت، اور حقوق شناسی اور حقوق کی ادائیگی وغیرہ تمام امتیازات ہیں۔

جب کہ مغرب میں اس طرح کا کوئی تصور نہیں ہے، وہاں ناجائز رشتوں کی بھرمار ہے، اور ازدواجی زندگی حد سے زیادہ کمزور اور بے اثر ہے، بلکہ وہاں ایسے اخبارات، میگزین اور کمیٹیاں ہیں جو اخلاقی بگاڑ اور ازدواجی زندگی میں خیانت کی دعوت دیتے ہیں، وہ اس کی ترکیبیں اور طریقے بتاتے ہیں، وہ عریانیت اور برہنگی کو تہذیبی امتیاز قرار دیتے ہیں اور پردہ و حجاب کو دقیا نو سیت کہتے ہیں۔

بعض اخبارات میں اس طرح کی سرخیاں بھی آتی ہیں کہ کیا آپ اپنی شریک حیات کو دھوکہ دینا اور اس کے ساتھ خیانت کرنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اپنی بیوی کے سامنے کوئی بہانہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں..... سے مدد طلب کیجئے۔

اس کو کمائی کا ایک ذریعہ بھی بنالیا گیا ہے، اور خیانت کے طریقے سکھانے والوں نے لاکھوں ڈالر کمائے ہیں۔

ابھی حال ہی میں سوڈان میں خرطوم کے گورنر ڈاکٹر مجذوب نے ایک قانون پاس کیا ہے جس میں ہوٹلوں وغیرہ میں عورتوں کو ملازمت سے روک دیا گیا ہے، اس قانون کو وہاں کے علماء اور ائمہ نے پوری طرح قبول کیا ہے اور اسے خوش آئند اقدام قرار دیا ہے، مگر اس پر مغربی میڈیا بڑے شد و مد سے جھنجھلا رہا ہے اور اسے آزادی نسواں پر حملہ قرار دے رہا ہے۔ مغرب کی ازدواجی زندگی میں صرف جنسی تسکین ہی مرکزی اہمیت رکھتی ہے، وہاں آزادانہ اختلاط ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے، اور اسی آزادی کی دعوت اہل مغرب ہر طرح کے وسائل استعمال کر کے دے رہے ہیں، میڈیا کا تمام تر زور اسی پر ہے، اور وہ فحاشی، آوارگی، عریانیت کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔

باعث افسوس بات یہ ہے کہ یہ دعوت قبول عام حاصل کر رہی ہے، اور اسلامی ممالک میں بھی اس وباء کی شدت کچھ کم نہیں ہے، فرزند ان توحید جو ایسے نظام کے حامل ہیں جو سراپا خیر و اعتدال ہی ہے اور تمام مسائل کا حل ہے ان کا اپنے تہذیبی و معاشرتی اقدار سے غافل ہو کر مغربی نظام کے پیچھے دوڑنا ایک عجیب و غریب سانحہ ہے، اور اسی میں ان کے زوال اور ضعف کا راز بھی مضمر ہے۔



# افراط اور غلو کی لعنت

انسان کا معاملہ بڑا عجیب و غریب ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ زندگی محدود ہے، دنیا کا قیام بیکر مختصر ہے، اور اس دنیا سے جانا ضرور ہے، مگر پھر بھی اس کی امیدیں لامحدود ہیں، اس کی تمنائیں اور آرزوئیں لامتناہی ہیں، وہ خواہشوں اور توقعات میں اس طرح پور پور ڈوبا ہوا ہے جیسے کہ دوام و بقاء اس کا مقدر ہو اور اسے اس دنیا میں ابد تک رہنا ہو۔

وہ کسی چیز کو چاہتا ہے اور محبت کرتا ہے تو انتہا تک پہنچتا ہے اور اس قدر افراط میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے اس کی محبوب شئی اور محبوب شخص میں خوبی ہی خوبی ہے، چاشنی ہی چاشنی ہے، کوئی خامی اور ترشی نہیں، اور جس سے نفرت کرتا ہے تو بھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے اور نفرت میں اتنا غلو کرتا ہے جیسے کہ اس قابل نفرت شئی اور شخص میں خامی ہی خامی ہے، کوئی خوبی نہیں، اپنی رائے کی تائید اتنی قوت سے کرتا ہے جیسے وہی حق ہے اور اس کے سوا سب غلط ہے، کسی رائے کی تردید کرتا ہے تو انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ سراسر باطل ہے، حق ہونے کا ادنیٰ احتمال بھی اس میں نہیں پایا جاتا۔

یہی وہ غلو اور افراط ہے جو حقائق کو مسخ کرتا ہے، سچائی کو بدل دیتا ہے، درستگی کو پلٹ دیتا ہے، مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے تعلقات کو منقطع کر دیتا ہے اور بغض و عداوت کی تخم ریزی کرتا ہے۔

ہماری سیاسی، علمی، ادبی ہر تاریخ افراط کے ان مظاہر سے پر ہے، محبت و عداوت میں اس افراط نے انتہائی دور رس، مؤثر عداوتوں اور تنازعوں کو جنم دیا ہے، اور اس کے نتیجے میں حق

وصواب کو مسخ کیا گیا، خیر کو مٹایا گیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کی قوت و شوکت کو ہلایا اور ختم کیا گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مابین، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ کے مابین، حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کے مابین رونما ہونے والے اختلافات اجتہادی بنیادوں پر ہوئے، یہ ممکن تھا کہ انہیں رائے اور فکر کا اختلاف قرار دیا جاتا مگر حضرت علیؓ کی محبت اور نفرت میں افراط اور غلو نے مسلمانوں میں باہم برسر پیکار مختلف فرقوں کو جنم دیا، شیعہ، خوارج و روافض، حامیان علیؓ اور مخالفین علیؓ کے مختلف طبقات پیدا ہوئے، اور آج تک ہیں، اور ان کی لڑائیاں، خونریزیاں تب سے اب تک جاری ہیں، اور اس کے لئے کتنا خون بہایا گیا، کتنا ظلم ہوا، شریعت کی کس قدر بے حرمتی ہوئی، اس کا اندازہ مشکل ہے، بنی امیہ اور ان کے مخالفین کے درمیان جو اختلاف تھا وہ بھی مثبت تنقید کے دائرہ میں باقی رہ سکتا تھا مگر اس میں بھی یہی محبت و نفرت کا افراط لڑائیوں، قتل و ظلم اور نہ جانے کتنی تباہیوں اور پستیوں کا باعث بنا۔

سیاسی میدان کے علاوہ علمی میدان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اسی افراط کی وجہ سے کتاب و سنت، فقہ و ادب، لغت و نحو کے متعدد بڑے علماء اور ائمہ کے سلسلہ میں بے اعتدالیاں سامنے آئیں، ان کی شہرت کو داغدار کیا گیا اور ان کے وقار کو مجروح کیا گیا، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی شخصیت کو محبت و نفرت کے افراط کے نتیجے میں شروع سے داغدار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور آج تک جاری ہے، ان کے مادحین و محبین کا غالی طبقہ ان کی منقبت میں جھوٹی موضوع احادیث پیش کر کے ان کو بدنام کرتا ہے، دوسری طرف ان کے دشمنوں اور مخالفین کا غالی گروہ ان کو جاہل اور کتاب و سنت سے بے خبر ثابت کر کے ان کو داغدار کرنا چاہتا ہے۔

ائمہ فقہاء اور محدثین کے باہمی اختلافات کو اسی افراط کے نتیجے میں حق و باطل کے معرکوں کی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ہے اور مناظروں کے سلسلوں نے اس کو مزید تقویت پہنچا کر امت کا نقصان ہی کیا ہے۔

کوفہ و بصرہ کے نحویوں کا خلاف، سیبویہ اور کسائی، متنبی اور جریر و فرزدق کے غالی ناقدین و مادحین کو اسی افراطِ عقیدت و نفرت نے لایعنی اور مضر سرگرمیوں میں مشغول رکھا، امام ابن تیمیہ بھی وہ شخصیت ہیں جن پر اسی غلو اور افراط کی وجہ سے ظلم ہوا، ان کے غالی مادحین نے ان کو سب سے اونچا مقام دیا اور ان کی شخصیت مجروح کی، جب کہ ان کے غالی ناقدین نے ان کو کفر و زندقہ کے الزام میں پھنسا کر اسیر زنداں ہونے پر مجبور کیا۔

آج پوری دنیا میں سیاسی سطح پر خصوصاً یہ افراط ہر جگہ نظر آتا ہے، ایک لیڈر کے غالی معتقدین اسے سب سے بڑا نجات دہندہ اور واحد مستحقِ قیادت باور کراتے ہیں اور دوسرے لیڈر کے سلسلہ میں نفرت و عداوت کا خوب اظہار کرتے ہیں، جب کہ اس کے غالی مخالفین اسے سب سے بڑا مجرم، نااہل اور خائن ثابت کرتے ہیں، یہی حال مختلف الفکر مشائخ و علماء کے مریدین و تلامذہ کا بھی ہے، یہی حال اخبارات اور ذرائع ابلاغ کا بھی ہے، آج اکثر ذرائع ابلاغ اسلام دشمنی کا جو ثبوت دے رہے ہیں، وہ اسلام کے تئیں ان کی نفرت کے افراط اور غلو کا واضح ثبوت ہے۔

سیاسی، علمی، فکری اور ادبی ہر سطح پر ہمارے اسی غلو و افراط اور اعتدال سے دوری نے حقائق کو کس قدر مسخ کیا ہے، کتنا ظلم کیا ہے، کتنوں کا حق مارا ہے، کتنا نقصان پہونچایا ہے، دشمنوں کو کتنی کامیابیوں سے نوازا ہے اس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اعتدال ہر بھلائی کی جڑ اور بنیاد ہے، اور یہی اسلام کا امتیاز ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں افراط و تفریط سے کنارہ کشی اور اعتدال و میانہ روی کی تعلیم و تلقین کرتا ہے، اسلام میں ایک طرف پیغمبر کی ذات کے سلسلہ میں افراط و غلو سے منع کیا گیا اور یہ تلقین کی گئی کہ نبی کو خدا کا بندہ و رسول سمجھا جائے، افراط و غلو کر کے اس میں الوہیت کی صفات نہ ثابت کی جائیں، اور دوسری طرف اسے خدا کے بعد سب سے افضل سمجھا جائے۔

دوسری طرف عبادت میں اتنا غلو نہ کیا جائے کہ نفس و جسم اور اہل و عیال کے حقوق میں کوتاہی ہو، روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما دن میں روزہ رکھتے اور رات بھر عبادت کرتے تھے، اہل و عیال کے حقوق سے غافل تھے، ان کی اہلیہ کی شکایت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ:

ایسا نہ کرو، روزہ رکھو اور افطار بھی کرو، عبادت بھی کرو اور آرام بھی کرو، تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، تمہارے اہل و عیال کا تم پر حق ہے۔  
(بخاری و مسلم)

اس طرح کے واقعات مختلف صحابہ کے ہیں، ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال، اور اللہ کے حق کے ساتھ نفس و اہل کے حقوق بھی ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔  
خرچ اور مصارف میں بھی اعتدال کا حکم ہے، ایک طرف اسراف اور فضول خرچی سے روکا گیا ہے اور دوسری طرف بخل اور ہاتھ روکے رکھنے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور یہ تلقین کی گئی ہے کہ ظلم سے بچا جائے، دشمن پر بھی ظلم نہ ہونے پائے، اور دوست کو دوستی کی رعایت میں دوسرے کا حق نہ دیا جائے، اور خواہش نفس کی پیروی نہ کی جائے۔

مختلف احادیث میں تعصب بیجا سے منع کیا گیا ہے، ایک جگہ فرمایا گیا کہ:  
تین چیزیں نجات دہندہ ہیں اور تین چیزیں تباہ کن ہیں، حالت غضب و رضا میں عدل و انصاف، خفیہ و علانیہ ہر حالت میں خوفِ خدا، فقر و غنی ہر حالت میں میانہ روی نجات کا باعث ہیں، جب کہ خود پسندی، اتباعِ ہولی، بخل و حرص تباہ کن امور ہیں۔  
(معجم اوسط: طبرانی)

قرآن کریم امتِ محمدیہ کو ”امتِ وسط“ اور ”خیر امت“ اسی لئے قرار دیتا ہے کہ اس

کی زندگی کا ہر شعبہ جو ہر اعتدال سے مزین اور آراستہ اور بے اعتدالی سے بالکل دور ہے۔  
 امت اس وقت مصائب و محن کا سامنا کر رہی ہے، اسے خطرات اور سازشوں سے  
 مقابلہ ہے، دشمن بے شمار اور بیدار و مستعد ہیں، ایسے ماحول میں یہ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ  
 اعتدال کو شیوہ و شعار بنایا جائے، دینی و دعوتی کارکنان کے اخلاص میں شک نہ کیا جائے،  
 بدگمانی نہ رکھی جائے، وقت ضائع نہ کیا جائے، وقت کا ہر لمحہ قیمتی سمجھا جائے اور افراط و غلو کی  
 ان لعنتوں سے کوسوں دور رہا جائے جو ہماری تباہی اور زوال کا باعث ثابت ہوں، سب سے  
 محفوظ و بے خطر شاہراہ اعتدال کی ہے، یہ امت کا امتیازی شعار ہے، امت کی فلاح و کامرانی  
 اور سعادت و نجات کا راز اسی کو اپنانے اور حرزِ جاں بنانے میں مضمر ہے۔



# احساسِ برتری اور احساسِ کمتری

مخلوقاتِ خداوندی میں انسان وہ عجیب و غریب مخلوق ہے جو بیک وقت مختلف تضادات کا مجموعہ ہے، انسان کی زندگی کے کچھ گوشوں کو بغور دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان تمام مخلوقات سے زیادہ توانا اور طاقت ور ہے، یہاں تک کہ وہ فضا میں اڑنے اور سمندر میں غوطہ زن ہونے پر قادر ہے، وہ مختصر ترین وقت میں طویل ترین مسافت طے کر سکتا ہے، وہ اپنی کد و کاوش اور حکمت و تدبیر سے خشک بے آب و گیاہ صحراؤں کو گھنے اور بارونق باغات میں تبدیل کر سکتا ہے، وہ تمام مخلوقات کو اپنا تابع فرمان بنا سکتا ہے، لیکن اگر دوسرے پہلو سے انسان کا جائزہ لیا جائے تو وہ اس کائنات کی کمزور ترین مخلوق نظر آتا ہے، حتیٰ کہ ایک ضدی مکھی اور چیونٹی بھی اس کی ناک میں دم کر دیتی ہے، اسے بے چین و پریشان کر ڈالتی ہے، ایک معمولی کاٹنا چھ جاتا ہے تو وہ بیمار و بے قرار ہو جاتا ہے، ایک برا اور موذی خیال و وسوسہ اُسے موت کے قریب پہنچا دیتا ہے۔

یہ عجیب و غریب تضادات کا مجموعہ انسانی مخلوق ہے جسے اللہ نے اپنے وجود کی ایک ظاہری دلیل بھی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ، وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ.

(الذاریات: ۲۰-۲۱)

ترجمہ: اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور

خود تمہارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟



انسان اپنی روحانی و جسمانی دونوں تخلیق کے اعتبار سے سب سے ممتاز و منفرد اور نمایاں ہے، وہ عالم اصغر ہے، اس کے چھوٹے سے جسم میں پوری کائنات نہاں ہے بقول شاعر:۔

وَتَزَعُمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ

وَفِيكَ اَنْطَوٰى الْعَالَمُ الْاَكْبَرُ

تم یہ سمجھتے ہو کہ تم چھوٹا سا جسم اور مختصر وجود رکھتے ہو جب کہ فی الواقع پوری دنیا تم میں چھپی ہوئی ہے، اسی لئے کہا گیا ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ.

ترجمہ: جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا، خودی کی معرفت کا نتیجہ خدا کی معرفت ہے۔

انسان کچھ پہلوؤں کے لحاظ سے بید قوی ہے اور کچھ پہلوؤں کے اعتبار سے بید ناتواں، اس لئے صاحب عقل وہی ہے جو قوت و ضعف کے پہلوؤں کو فراموش اور نظر انداز نہ کرے، وہ اپنی قوت، ذہانت اور معلومات پر اڑ نہ دکھائے اور اپنی برتری کا مدعی نہ ہو، اور اس کا احساس برتری کبر و غرور کی حد تک نہ پہنچے، اسی طرح وہ اپنی کمزوری، بے بسی اور ناتوانی کے پیش نظر اپنے کو حقیر نہ سمجھے اور اس کا احساس کمتری ناکامی کی حد تک اسے نہ پہنچائے۔

افراد و اقوام کی یہ دو بیماریاں ہوتی ہیں کہ یا تو ان کا احساس برتری کبر و تفاخر تک پہنچ جاتا ہے، یا ان کا احساس کمتری حقارت و ذلت سے جا ملتا ہے، کبر و غرور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے کو ذلیل و حقیر باور کرنے لگتا ہے، جن امور پر اسے قدرت نہیں ہوتی ان پر قدرت کے فضول دعوے کرنے لگتا ہے، اپنے دائرہ کار و اختیار سے خارج چیزوں میں دخل اندازی کر بیٹھتا ہے، جن چیزوں سے نا آشنا ہوتا ہے ان سے آشنائی اور آگاہی کا مدعی ہو جاتا ہے، پھر وہ کسی کے نصائح اور ہدایات پر کان نہیں دھرتا، کسی بڑے کو بڑا نہیں مانتا، اس کے

سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا، کسی عالم کا احترام نہیں کرتا، کسی صاحب فضل کے فضل کا اعتراف نہیں کرتا، وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا عقل مند، سب سے با عظمت و عالی مرتبت، ادب و اکرام کا اولین اور بجا طور پر مستحق سمجھنے لگتا ہے۔

تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ بیماری ان افراد میں زیادہ ہوتی ہے جو پستی سے یکا یک کچھ بلندی کی طرف، ناداری و فقر سے اچانک کچھ مالداری و دولت مندی کی طرف، پسماندگی سے یک بیک کچھ ترقی کی طرف آتے ہیں، جو پہلی بار دولت پالیتے ہیں یا اتفاقاً کوئی عہدہ ان کے ہاتھ آ جاتا ہے ان کی حالت یہی ہوتی ہے کہ ان کا مزاج تکبر و تعلیٰ کی آخر حد تک پہنچ جاتا ہے بلکہ وہ دوسروں کو انسان بھی سمجھنا گوارا نہیں کرتے، اور ہر ایک کو جاہل و احمق قرار دینے لگتے ہیں۔

کسی قوم میں یہ بیماری جب جڑ پکڑ لیتی ہے تو وہ قوم بے راہ رَو ہو جاتی ہے، وہ خیر خواہوں کو بدخواہ سمجھنے لگتی ہے، تعزیرِ مذلت میں گرنے کے باوجود وہ اپنے کو علیین پر مقیم باور کرتی ہے، مصائب کے گھیرے میں ہونے کے باوجود وہ اپنے کو مکمل محفوظ قرار دیتی ہے، دشمنوں کے نرغے میں ہونے اور اپنے بے بس و مغلوب ہونے کے باوجود اپنے کو سب سے طاقت ور اور غالب اور دشمن کو سب سے کمزور سمجھتی ہے، نتیجتاً اس قوم پر ادبار مسلط ہو جاتا ہے اور وہ کارگاہِ حیات میں کوئی تعمیری انقلاب تو کجا اپنے وجود کی حفاظت تک سے قاصر رہ جاتی ہے۔

دوسری بیماری احساس کمتری ہے، جو انسان اپنی کمتری اور کہتری کا احساس کر لیتا ہے وہ شکستہ خاطر، مردہ دل، بے حوصلہ، منکسر الارادۃ، اور ناامیدی کا شکار ہو جاتا ہے، اور خود اعتمادی کے جوہر سے محروم ہو جاتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ زندگی میں کوئی کام اور اقدام اس کے بس کا نہیں ہے، کسی قوم میں جب یہ مرض آتا ہے تو اس کی حیات و حرکت، سعی و عمل سب شل ہو جاتے ہیں، وہ ذلت کا نشانہ بنالی جاتی ہے، اور ہر لحاظ سے اسے کمزور کر دیا جاتا ہے اور اسے لوٹ کھسوٹ لیا جاتا ہے۔

امتِ مسلمہ میں عمومی طور پر یہی مرض موجود ہے، اور اس کے نتائج کھلی آنکھوں سے

دیکھے جاسکتے ہیں، اور خاص طور پر بعض افراد امت میں کبر و غرور کی جو بیماری پائی جاتی ہے اس کا نتیجہ بھی عالم آشکارا ہے۔

جب کہ اسلامی تعلیمات میں احساس برتری کے افراط اور احساس کمتری کی تفریط دونوں سے نکال کر خود اعتمادی اور جذبہ عمل کے اعتدال کی ترغیب کے نمونے جا بجا دیکھے جاسکتے ہیں، ایک طرف اسلام کبر و غرور سے سختی سے منع کرتا ہے، اسے پستی و ذلت کا سبب بتاتا ہے، اور یہ واضح کرتا ہے کہ ہر نعمت اللہ کی عطا کردہ ہے، ہر قوت اس کی بخشیدہ ہے، ہر صلاحیت اسی کی ودیعت کردہ ہے، سب سے بڑا وہی ہے، سب سے زیادہ علم اسی کو ہے، اس کے مقابلے میں انسان بیحد ناتواں، جاہل، عاجز و بے بس ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے:

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نُّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ. (النحل: ۵۳)

ترجمہ: جو نعمت بھی تم کو ملتی ہے وہ منجانب اللہ ہے۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ. (یوسف: ۷۶)

ترجمہ: ہر جاننے والے سے بڑا جاننے والا موجود ہے۔

وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا. (الاسراء: ۸۵)

ترجمہ: تمہیں تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اسی طرح اسلام غرور و کبر سے روکتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی اسی کی عملی تعلیم ہے، فتح مکہ کے موقع پر کافروں کی سابقہ لاتعداد اور سخت ترین اذیتوں کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبر و غرور کا ادنیٰ سا مظاہرہ نہ خود فرمایا اور نہ صحابہ سے ہونے دیا بلکہ جانی دشمنوں کو یک لخت معاف کر دیا اور اپنی تواضع اور حسن اخلاق سے دل فتح کر لئے، اور فرمایا:

أَنَا ابْنُ امْرَأَةٍ مِّنْ قُرَيْشٍ كَانَتْ تَأْكُلُ الْقَدِيدَ.

ترجمہ: میں ایک قریشی خاتون کا فرزند ہوں جو سوکھے گوشت کے ٹکڑے

پر گزارہ کرتی تھی۔

رسالت، نبوت، کمالِ علم و فضل، حکمت و فراست اور فتح و کامیابی سب سے بہرہ مند ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس متواضعانہ اور کبر و غرور سے کوسوں دور رویے میں قیامت تک لئے پوری انسانیت کے احساسِ برتری اور کبر و غرور سے اجتناب کی بے انتہا جامع اور مؤثر عملی تعلیم ہے۔

دوسری طرف اسلام احساسِ کمتری سے روکتا ہے، خود اعتمادی پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے، قرآن اسی لئے امت محمدیہ کو امتِ وسط اور خیر امت کہتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ اگر تم مؤمن کامل ہو جاؤ تو سر بلندی تمہیں ہی ملنی ہے، اسی طرف ارشاد نبوی ہے:

لَا يَحْقِرَنَّ أَحَدُكُمْ نَفْسَهُ.

(ابن ماجہ)

ترجمہ: تم میں سے کوئی ہرگز اپنے کو حقیر نہ سمجھے۔

صحابہ کی تاریخ میں احساسِ کمتری کا کوئی تصور نہیں ملتا، کسی صحابی نے اپنے کو کمتر نہیں سمجھا، دشمنوں کی بے پناہ قوت و کثرت کے باوجود صحابہ کا اعتماد باقی رہا اور اسی لئے وہ فاتح و کامران رہے، مرعوبیت اور احساسِ کمتری زندہ قوموں کی علامت نہیں ہے، امت محمدیہ کے اکثر افراد جو آج مرعوبیت اور احساسِ کمتری کے شکار ہیں اگر اپنے دلوں میں خود اعتمادی پیدا کر لیں اور ایمانِ کامل کی دولت سے مالا مال ہو جائیں تو وہ ذلت و مسکنت کے شکنجہ سے باہر آ سکتے ہیں، اور ان کے حق میں یہ وعدہ الہی پورا ہو سکتا ہے:

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ.

(القصص: ۵)

ترجمہ: ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر مہربانی کریں جو زمین میں ذلیل و کمزور کر کے رکھے گئے ہیں اور انہیں پیشوا بنادیں اور انہیں کو وارث بنائیں۔



# بندۂ مؤمن کے پانچ دشمن

ایک بندۂ مؤمن کو اپنی زندگی اور ایمانی ترقی کی راہ میں عام طور پر پانچ دشمنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پہلا دشمن تو اس کی خواہشات نفس ہیں، دوسرا دشمن شیطان ہے، تیسرا دشمن کفار ہیں، چوتھا دشمن منافقین ہیں، اور پانچواں دشمن ظالم و فاسق افراد ہیں، ایمان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان پانچوں دشمنوں سے جہاد اور مقابلہ کیا جائے، مگر جہاد کی نوعیت الگ الگ ہوگی جس کی کچھ وضاحت ذیل میں کی جا رہی ہے۔

## (۱) جہادِ نفس:

اس کی چند صورتیں ہیں:

(۱) حصولِ علم دین: یعنی قرآن و سنت اور سیرت صحابہ و سلف صالح کی روشنی میں دین حق اور ہدایت کو سیکھا جائے، تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ نفس کی خواہشات کو لگام دی جاسکے گی، حصولِ علم جہادِ نفس کا نقطۂ آغاز ہے، جہالت عام طور پر نفسانی خواہشات کا غلام اور اسیر بنادیتی ہے۔

(۲) عمل صالح پر مداومت: علم و معرفت اس وقت تک سودمند اور بار آور نہیں ہو سکتے جب تک عمل صالح کی پابندی نہ کی جائے، بلکہ بقول عربی شاعر:۔

لَوْ كَانَ لِلْعِلْمِ مِنْ دُونِ التَّقَى شَرَفٌ

لَكَانَ أَشْرَفَ خَلْقِ اللَّهِ إِبْلِيسُ

ترجمہ: اگر بغیر عمل و تقویٰ کے علم کا کوئی شرف اور مقام ہوتا تو اللہ کی

مخلوق میں سب سے معزز ابلیس ہوتا۔

صحابہ کرام کا امتیاز یہی تھا کہ وہ علم و عمل کے حیرت انگیز حد تک جامع تھے، اور واقعہ یہی ہے کہ اس جامعیت کے بغیر جہاد نفس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) دعوتِ حق: یہ بہت اہم کام ہے، خاص طور پر فتنوں اور جہالت و ضلالت کے غلبے کے اس دور میں اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، اور جہاد نفس کی تاثیر و تکمیل میں اسے اساسی مقام حاصل ہے۔

(۴) راہِ دعوت کی مشقتوں پر صبر: اس راہ میں مزاحمتوں اور مشقتوں کا پیش آنا یقینی امر ہے، ایک مجاہد جہی کامیاب ہو گا جب وہ ان دشواریوں کو راہِ حق کا تحفہ سمجھ کر برداشت کر لے۔

## (۲) شیطان سے جہاد:

یہ بالکل واقعہ ہے کہ شیطان مردِ مؤمن کا ازلی ابدی دشمن ہے، اس نے اسے گمراہ کرنے کی روزِ اول سے قسم کھا رکھی ہے اور اس مہم میں مکمل سرگرم بھی ہے، اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہے کہ شیطان ان کا کھلا ہوا دشمن ہے، وہ گناہوں کو خوشنما کر کے پیش کرتا ہے، انسان کے اندر سے احساسِ گناہ ختم کرنا چاہتا ہے، اور جنت کی راہ سے ہٹا کر جہنم کی راہ پر چلانے کا آرزو مند رہتا ہے، قرآن کی تقریباً سو آیات میں شیطان کا نام لے کر اس کی گمراہ کرنے کی مہم کا ذکر ہے اور اہل ایمان کو شیطان سے بچنے اور اس کی وسوسہ اندازیوں کا مقابلہ کرنے کا حکم ہے۔

شیطان کا سب سے برا وسیلہ تَصْلِيلِ خواہشِ نفس ہے، جو خواہشِ نفس کا پیرو ہے وہ فی الواقع شیطان کا غلام ہے، تکبر و گھمنڈ بھی شیطانی گمراہ کاری کا اہم ذریعہ ہے، شیطان سے جہاد کا جو حکم ملا ہے اس کے دو قوی ہتھیار بھی بتائے گئے ہیں: (۱) ذکر (۲) فکر۔ ذکر الہی اور اللہ کو ہمہ وقت یاد اور متحضر رکھنے کی برکت اور فکر و عقلِ سلیم کی نصرت و قوت سے شیطان کی وسوسہ اندازیوں، گناہوں کی ملمع کاریوں کا پردہ چاک کیا جاسکتا ہے، اور ان سے اپنے کو بچایا جاسکتا ہے، ساتھ ہی توبہ، رجوع الی اللہ، استغفار، شیطان اور اس کے شر و وسوسے سے پناہ

طلبی اور معاصی پر ندامت بھی وہ طریقے ہیں جو شیطان کا وارکند و ناکام بناتے ہیں۔

### (۳) کافروں سے جہاد:

اہل کفر و باطل اہل حق کے دشمن ہوتے ہیں، اہل ایمان کو ان سے جہاد کا حکم ہے، مگر مرحلہ بندی کر دی گئی ہے، سب سے پہلے دعوتی و قرآنی جہاد کرنا ہے یعنی افہام و تبلیغ، یہ بے اثر ہو تو دوسرا مرحلہ عملی جہاد کا ہے اور کفر کی طاقت کو ختم کرنے کا ہے، دعوتی جہاد تو ہر جگہ اور ہر حالت میں ہو سکتا ہے، عملی جہاد کے لئے یہ شرط ہے کہ اہل ایمان مقابلے کی پوزیشن میں ہوں، ورنہ اگر اہل ایمان بالکل کمزور ہوں تو مکی زندگی کا صبر و ثبات نمونہ کے طور پر موجود ہے۔

### (۴) منافقوں سے جہاد:

اہل حق کے لئے سب سے خطرناک اور زہریلا گروہ مارِ آستین منافقوں کا ہوتا ہے جن کے ظاہر و باطن میں تضاد ہوتا ہے، وہ زبانی مدعی ایمان ہوتے ہیں، مگر ان کے دل کفر سے لبریز ہوتے ہیں، ان کے اندر بے حد مکر و غدر کے اوصاف ہوتے ہیں، اور وہ فتنہ و اختلاف بھڑکانے کے عادی ہوتے ہیں، ساتھ ہی وہ بے انتہا بزدل، فحش پسند، افواہ پھیلانے والے اور معاند ہوتے ہیں، اہل ایمان کو ان سے جہاد کا صریح حکم ہے، اگر مسلمان کمزور ہوں تب تو ان کو حکم ہے کہ وہ عملی جہاد نہ کریں بلکہ منافقوں سے چوکنے رہیں اور صبر سے کام لیں، اور اگر طاقت ور ہوں تو عملی جہاد کے ذریعہ ان کا کام تمام کر دیں، اہل ایمان سے ایمان کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اہل نفاق سے دوستی نہ رکھیں، قریب نہ ہوں، ان کا بائیکاٹ کریں، ان پر اعتماد نہ کریں، جہاد کے موقع پر انہیں ساتھ نہ لیں، اہم معاملات ان سے مخفی رکھیں، ساتھ ہی حسبِ موقع انہیں سمجھائیں، اللہ کے عذاب سے ڈرائیں اور اخلاصِ ایمانی

کی دعوت دیں۔

## (۵) ظالموں اور فاسقوں سے جہاد:

اہل اسلام کو یہ حکم بھی ہے کہ اپنے ظالم اور فاسق بھائیوں سے بھی جہاد کریں، یہ جہاد دعوتی ہوگا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا ذریعہ ہے، حسبِ طاقت ہاتھ یا زبان یا دل سے منکر کی تبدیلی کا حکم ہے، اور اس کے بڑے فضائل احادیث میں آئے ہیں اور اس کو چھوڑنا سخت جرم بتایا گیا ہے۔

ایک بندہ مؤمن اگر اپنی عملی زندگی میں ان پانچوں طرح کے جہاد کو اختیار کر لے تو اس کی ایمانی قوت اور خوش بختی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔





# سب سے بیش قیمت سرمایہ صالح افراد ہیں

تاریخ کے ہر دور میں ہر قوم و ملت کو ایسے صالح، نیک طینت، پرہیزگار اور وفا شعار افراد کی ضرورت رہی ہے جو اس کی قیادت کر سکیں، اس کو منجھدار سے نکال سکیں، اس کے مسائل و مشکلات کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور عملی اقدامات کریں، ایسے افراد کے وجود سے امت میں جو توانائی، خود اعتمادی اور بیداری پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور چیز سے نہیں پیدا ہو پاتی، سب سے بیش قیمت چیز یہی جاں باز افراد ہوتے ہیں، مال و دولت کے انباران کے سامنے بے اہمیت ہوتے ہیں۔

ایسے مخلص افراد کی جب تک قدردانی، حوصلہ افزائی اور مدد دہوتی ہے قوم ترقی و اقبال کی شاہراہوں پر چلتی جاتی ہے اور جب ان کی ناقدری، حوصلہ شکنی اور مخالفت ہوتی ہے، ان کی جگہ نا اہل خوشامد پسند خود غرض افراد آجاتے ہیں تو قوم زوال و انحطاط کے دلدل میں پھنستی چلی جاتی ہے۔

مخلص افراد قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں اور ان کے دم سے قومیں آباد رہتی ہیں، امام بخاریؒ نے تاریخ صغیر میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں اہل نظر کے لئے کافی سامان عبرت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار اپنے اصحاب سے کہا کہ آج تم لوگ اپنی تمنائیں اور آرزوئیں بیان کرو، اس پر ایک شخص نے کہا کہ میری آرزو یہ ہے کہ یہ گھر مال و دولت سے بھرا ہوتا اور میں اُسے راہِ خدا میں خرچ کرتا۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میری خواہش یہ ہے کہ اس مکان کے برابر سونا ہوتا اور میں اُسے اللہ کے راستے میں صرف کرتا۔

تیسرے نے کہا کہ میری طلب یہ ہے کہ اس گھر کے برابر جواہرات ہوتے اور میں انہیں فقراء میں تقسیم کر دیتا۔ آخر میں سب کی تمنائیں سن لینے کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ”میری تمنا یہ ہے کہ یہ مکان ابو عبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے افراد سے بھرا ہوتا اور میں انہیں اللہ کی اطاعت میں استعمال کرتا“۔ (التاریخ الصغیر/۲۳۳)

حضرت عمرؓ نے تین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا نام لے کر یہ واضح کر دیا کہ کام کا انسان سب سے قیمتی دولت ہے، اور یہ ایسا گوہر ہے جو نایاب نہیں تو کم یا ب ضرور ہے، اور اس کی قدر بھی خال خال ہی لوگ کر پاتے ہیں: ع

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں خود زبانِ رسالت سے یہ الفاظ جاری ہوئے کہ ہر امت میں کوئی نہ کوئی امین ہوتا ہے اور اس امت کے امین ابو عبیدہ بن جراح ہیں، تاریخِ اسلامی میں ان کی امانت و صلاح، جانبازی و دلیری، قربانیوں اور ایثار کی داستان ثبت ہے، جنگ بدر میں اپنے کافر باپ کو مار کر انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا جوشِ توحید نسبی تعلق و قرابت پر غالب ہے، انہوں نے اپنے باپ کی صورت میں شرک کو قتل کیا تھا، چنانچہ قرآن کریم کی سورہ مجادلہ کی آخری آیت میں اس کا ذکر آیا اور اللہ نے یہ اعلان کر دیا کہ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں، وہ اللہ کے گروہ میں ہیں جس کا مقدر فلاح و کامرانی ہی ہے، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی خدا ترسی، اتباعِ سنت، تواضع و زہد اور حلم و تحمل بہت معروف ہیں۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بقول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امتِ محمدیہ میں حلال و حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے صحابی ہیں، انہیں یمن کا والی بنایا گیا، ان کے زہد و استغناء کے متعدد واقعات محفوظ ہیں۔

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتنے قابل اعتماد صحابی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے راز بتا دیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا کہ حذیفہ تم سے جو بیان کریں اس کی تصدیق کرو، منافقین کی پوری فہرست ان کے پاس رہا کرتی تھی، اتباع سنت ان کا ایک خاص وصف تھا، یہ واقعہ مشہور ہے کہ انہیں ایران میں کسریٰ کی طرف سے مذاکرات کے لئے دعوت دی گئی، کھانا لایا گیا، آپ نے کھانا شروع کیا، درمیان میں ایک لقمہ آپ کے ہاتھ سے نیچے گر گیا، اس وقت آپ کو وہ حدیث یاد آئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر نوالہ نیچے گر جائے تو اسے اٹھا لو، صاف کر کے کھا لو، ضائع نہ کرو، کیونکہ وہ اللہ کا رزق ہے، اور کیا معلوم کہ اللہ نے رزق کے کس حصے میں برکت رکھی ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ نے نیچے گرا ہوا لقمہ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا، بغل میں موجود شخص نے کہنی مار کر آپ کو اشارہ کیا کہ یہ شاہ کسریٰ کا دربار ہے، یہاں اگر تم نیچے گرا لقمہ اٹھاؤ گے تو ذلیل و بے وقعت سمجھے جاؤ گے، اس پر حضرت حذیفہ نے جواب دیا کہ کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے اپنے محبوب پیغمبر کی سنت چھوڑ دوں؟ یہ حقیر و ذلیل سمجھیں یا باعزت و شریف، میں سنت پر عمل سے دستبردار نہیں ہو سکتا، چنانچہ پھر اسی اتباع سنت کی برکت سے انہوں نے ایران کو فتح کر لیا۔

ان تین صحابہ کرام کی زندگیاں نمونہ تھیں، اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میری آرزو یہ ہے کہ ایسے افراد کی کثرت ہو، واقعہ یہی ہے کہ ہمارے معاشرے کا بگاڑ اسی وقت دور ہوگا اور ہمارا زوال اسی وقت ختم ہوگا جب ایسے جیلے اور تقویٰ شعار افراد قائدانہ مقام پائیں گے، ضرورت ایسے افراد کو تیار کر کے میدانِ عمل میں لانے اور ان کی رہنمائی میں عملی اقدامات انجام دینے کی ہے، خاموشی اور غفلت وہ جرم ہے جو معاف نہیں ہو سکتا۔



# عصرِ حاضر کا شرک

ترقی یافتہ صنعتی انقلاب سے دوچار دنیا کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مادیت کی یلغار نے انسان کو اتنا اپنے بس میں کر لیا ہے کہ وہ طبعی و مادی و فنی اسباب کو خدا سمجھ بیٹھا ہے، عصرِ حاضر کا یہی وہ شرک ہے جس میں آج کی مادی تہذیب مبتلا ہے۔  
بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:

”عہدِ حاضر کے انسان نے اپنی پوری زندگی ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت، کامیابی و ناکامی، اقبال و ادبار، خوش نصیبی و بد نصیبی سب ان کے ہاتھ میں ہے، اسبابِ مادی، کائناتی قوتوں اور نیچر کی یہ پرستش و تقدیس اور اہل اختصاص اور ماہرین فن پر اعتماد کلی اور ان کو خدا کے درجہ پر رکھنا ایک نئی وثنیت اور نیا شرک ہے، اس نے قدیم بت پرستی کے ذخیرہ میں ایک نئی قسم کی بت پرستی کا اضافہ کیا ہے جو ایمان اور عبدیت کی حریف ہے۔“  
(معرکہ ایمان و مادیت/۸۳)

قرآن کریم میں اس شرک کی تردید کا مضمون جا بجا آیا ہے، قرآن کی اصطلاح میں دنیوی زندگی جلد ختم ہونے والی کھیتی کے مانند ہے، دنیوی زندگی اور مادیت کی چمک دمک جس کو منفعت پرست و لذت پسند افراد اپنا مرکز و معبود بنا کر رہتے ہیں، قرآن کی زبان میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اللہ نے پانی برسایا، جس کی وجہ سے زمین خوب پھلی پھولی لیکن پھر سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا، ایسے ہی دنیوی زندگی بھی فنا ہونے والی ہے، سورہ کہف میں باغ والے کا واقعہ ذکر ہوا ہے، اللہ نے اس پر اپنی نعمتیں انڈیل دی تھیں، انگور کے دو باغ عطا کئے، باغوں کو خرموں سے گھیر دیا، درمیان میں کھیتی بھی تھی، باغوں میں بلا کسی نقصان اور کمی کے پورا

پھل آتا تھا، باغوں کے درمیان نہر جاری کر دی تھی، اس کے علاوہ مزید مال و زر اور دولت سے نوازا تھا، ان سب نوازشوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ شکر ادا کرتا، مگر اس نے تکبر کیا، اپنے مال کی کثرت پر اکر ڈکھائی، قیامت کا انکار کیا، اللہ کی قدرت مطلقہ کا منکر ہو گیا، اس کے موحد ساتھی نے اسے سمجھایا اور کفر و ناشکری اور غرور و تکبر کی بد انجامی سے ڈرایا مگر اسے ہوش نہ آیا، بالآخر اللہ نے اپنا عذاب بھیج دیا، اس کا باغ اور سارا مال ختم ہو گیا اور وہ ہاتھ ملتارہ گیا، اور کہنے لگا کہ کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، معلوم ہوا کہ اس کا شرک یہ تھا کہ اس نے اسبابِ ظاہر کو تمام خوشحالی اور دولت کا سرچشمہ سمجھ لیا تھا، اور اللہ کو فراموش کر بیٹھا تھا، یہی مادہ پرستی کا شرک ہے جو عصر حاضر کا بہت بڑا ناسور ہے۔

مدعیانِ اسلام کی اکثریت اس شرک میں عملی طور پر مبتلا ہے، قرآن کریم اسی کی بیخ کنی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ، وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ.

ترجمہ: دنیوی زندگی کا ساز و سامان بے مایہ ہے، خدا ترسوں کے لئے

آخرت بدرجہا بہتر ہے۔



# مادہ پرستی کا طوفان

اس وقت پوری دنیا سر سے پیر تک پوری طرح سے مادہ پرستی کے عمیق اور مہیب گڈھے میں گرتی جا رہی ہے، مال و دولت ہی کو ہر چیز کے حسن و قبح کا معیار قرار دیا جاتا ہے، روحانیت اور پاکیزگی کے الفاظ موجودہ نظریات کے لغت میں اجنبی سمجھے جاتے ہیں، ہر چیز کو مادیت کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے، معرکے اور لڑائیاں بھی مادیت ہی کے مقصد سے لڑی جاتی ہیں، حصولِ تعلیم کا بھی منشا اب حصولِ مال و زر بن گیا ہے، مالی فائدوں سے لبریز چیز بہتر اور اس سے خالی چیز بدتر گردانی جاتی ہے، حتیٰ کہ اگر آپ کسی دوست کو خوبصورت گلاب تحفہ میں دیں تو وہ اس کی قیمت کے اندازوں میں لگ جاتا ہے اور گلاب کی خوبصورتی، ہدیہ کے پیچھے مخفی جذبہ محبت و تعلق سب سے لا تعلق ہو کر صرف مادّی قیمت کے اندازے کو پیش نظر رکھتا ہے، مادہ پرستی کے طوفانِ بلاخیز کا یہ ایک نمونہ ہے، ورنہ فی الواقع اب ہر شعبہ زندگی میں اس طوفان نے اپنے پنچے اس طرح گاڑ دیئے ہیں کہ اس سے رُست گاری بے حد دشوار نظر آتی ہے۔

مسجدیں اور عبادت گاہیں تک اس کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں، ادیب و فنکار افراد کا طبقہ اس کے نرغے میں بری طرح پھنسا ہوا ہے، ادباء کی قلمی تخلیقات اجرتوں اور معاوضوں کی مقدار کے لحاظ سے سامنے آتی ہیں، جتنی زیادہ اجرت دی جاتی ہے تخلیق میں ادیب اتنی ہی زیادہ سحر اثری پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، مادہ پرستی ہی کا اثر ہے کہ اب ادباء تعمیری، سنجیدہ اور مثبت موضوعات کے بجائے غیر سنجیدہ موضوعات، ناول، ڈراموں وغیرہ پر توجہات مرکوز رکھتے ہیں، فنش نگاری کی قدر اسی لئے بڑھ گئی ہے کہ اس راہ سے مادی آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔

مادہ پرستی میں پور پور غرق سماج تارکیوں اور ظلمتوں میں مجبوس اور روشنی سے محروم و تہی دامن رہتا ہے، اور پھر اس کے مسموم اثرات سے پورے پورے علاقے متاثر ہوتے ہیں، مادہ پرستی کا سرا براہ راست جہالت اور حقیقت نا آشنائی سے ملتا ہے، انسان جب وقتی لذتوں کو دائمی اور فانی چیزوں کو ابدی باور کرنے لگتا ہے تو پھر وہ وقتی مادی چیزوں ہی کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے، نفس و شیطان کے بہکاوے اور دائم تحریر میں وہ الجھتا اور پھنستا چلا جاتا ہے۔

حالانکہ اگر عقل سلیم کا استعمال کیا جائے تو یہ حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دنیوی رونقیں محض سراب ہیں، ان کے وجود کو کوئی قرار و دوام نہیں ہے، وہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہیں، ان کی مثال قرآن کی زبان میں ایسی ہے جیسے کہ بارش ہوتی ہے، اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوتے ہیں، پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زرد ہو جاتی ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔

دنیوی رونقوں کا حال یہی ہے کہ وہ ناپائیدار چیزیں ہیں، کوئی صاحب عقل باہوش انسان کبھی ان کے فریب میں آکر دائمی و سرمدی چیزوں سے کنارہ کش اور فانی چیزوں کی طرف راغب و فریفتہ نہیں ہو سکتا، اب جو لوگ ان وقتی رونقوں کے فریب میں گرفتار اور اصل چیزوں سے بیزار ہیں وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس درجہ بے عقلی میں مبتلا ہیں؟ مادہ پرستی اور بے عقلی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک کو دوسرے سے کبھی بھی کسی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا۔



# زاهد کے اوصاف

ارشاد نبوی ہے:

أَزْهَدُ النَّاسِ مَنْ لَمْ يَنْسَ الْقَبْرَ وَالْبَلَىٰ وَتَرَكَ أَفْضَلَ زِينَةِ الدُّنْيَا، وَآثَرَ مَا يَبْقَىٰ عَلَىٰ مَا يَفْنَىٰ، وَلَمْ يَعُدَّ غَدًا مِنْ أَيَّامِهِ، وَعَدَّ نَفْسَهُ فِي الْمَوْتَىٰ. (فيض القدير: ۱/۶۱۷ بحوالہ شعب الایمان للبيهقي)

ترجمہ: لوگوں میں سب سے بڑا زاهد وہ ہے جو قبر اور بوسیدگی کو فراموش نہ کرے، دنیوی زندگی کی عمدہ ترین آرائش و زیبائش کو چھوڑ دے، باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دے، اپنی زندگی کے اگلے دن کو شمار نہ کرے، اور اپنا شمار مردوں میں کر لے۔

زہد کی حقیقت یہ ہے کہ انسان دنیوی لذتوں میں اشتغال سے آخرت کے لئے بے رغبت ہو جائے اور عیش و تنعم کی زندگی سے دست بردار ہو جائے، قرآن و حدیث کے متعدد نصوص میں زہد کی تلقین و تعریف کا مضمون اور اس کے فوائد و اثرات کا بیان آیا ہے اور دنیوی لذتوں میں انہماک سے سختی سے روکا اور اس کی مذمت و مضرت کا ذکر کیا گیا ہے۔

زہد کو خدا اور خلق خدا کی محبوبیت کا ذریعہ بتایا گیا ہے، حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب سے فرمایا:

إِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللَّهُ، وَأَزْهَدْ فِي مَا عِنْدَ النَّاسِ

(ترمذی شریف)

يُحِبَّكَ النَّاسُ.



ترجمہ: دنیا کی طرف سے اعراض اور بے رخی اختیار کرلو، تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا، اور جو (مال و جاہ) لوگوں کے پاس ہے اس سے اعراض اور بے رخی اختیار کرلو، تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

احادیث شریفہ میں یہ بھی آیا ہے کہ:

مَا زَهَدَ عَبْدٌ فِي الدُّنْيَا إِلَّا أَتَتْهُ اللَّهُ الْحِكْمَةُ فِي قَلْبِهِ، وَأَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهُ، وَبَصُرَهُ عَيْنُ الدُّنْيَا وَدَاءَهَا، وَأَخْرَجَهُ مِنْهَا سَالِمًا إِلَى دَارِ السَّلَامِ.

(شعب الایمان / بیہقی)

ترجمہ: زہد اختیار کرنے والے کو منجانب اللہ حکمت القا کی جاتی ہے، اس کی زبان پر کلماتِ حکمت جاری کر دیئے جاتے ہیں، اس کی نگاہوں کے سامنے دنیا کے عیوب و مفاسد آ جاتے ہیں، اور دنیا سے اس کو سلامتی کے ساتھ نکال کر جنت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں یہ بتایا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا زہد وہی ہے جو پانچ اوصاف کا حامل ہو۔

## (۱) قبر اور بوسیدگی کو فراموش نہ کرے:

یعنی موت، عالم قبر و برزخ، قبر کی وحشت و ہولناکی اور تنہائی کو یاد رکھے اور یہ فراموش نہ کرے کہ اسے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، اور فنا ہونا ہے، دوام کسی کو میسر نہیں ہے، احادیث میں موت کو ”هَازِمُ اللَّذَاتِ“ (لذتوں کو ختم کرنے والی) کہا گیا ہے اور اسے بکثرت یاد کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ (ترمذی شریف)

قبروں کی زیارت کا جو حکم ہے اس کے متعدد مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خوف پیدا ہو اور قبر و موت کی یاد تازہ رہے جس کا نتیجہ اعمالِ صالحہ کی صورت میں ظاہر ہوگا، موت

سے غفلت انسان کے دنیا دار ہونے اور شقی القلب ہونے کی دلیل ہے، جب کہ موت کی یاد اور اس کی تیاری انسان کے دانش مند و ہوشیار رہنے کی دلیل ہے۔

## (۲) دنیوی زندگی کی عمدہ ترین آرائش کو چھوڑ دے:

دنیوی زندگی کی زیب و زینت اور متاع و دولت عارضی اور بے مایہ ہے، اسی لئے احادیث و آیات قرآنیہ میں دنیوی آرائشوں سے اور اس میں انہماک سے شدت سے منع کیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ طالب دنیا کا دل ہمیشہ پراگندہ، بے سکون اور غیر مطمئن رہتا ہے، اور مال و دولت کے پرستار پر لعنت خداوندی ہوتی ہے، بقدر کفاف پر رضا و قناعت اور دنیا طلبی سے دوری قابل تعریف عمل اور رحمت الہی کا ذریعہ اور فلاح و کامرانی کا وسیلہ ہے۔

## (۳) باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دے:

باقی رہنے والی چیز آخرت ہے، اور فنا ہونے والی چیز دنیا ہے، قرآن و حدیث میں دنیا کو متاع، لہو و لعب، فریب، اور وقتی زینت بتایا گیا ہے جب کہ آخرت کو دارالقرار، خیر و پائندہ تر، اور افضل و اشرف بتایا گیا ہے، اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ انسان دنیا کو بالکل حقیر و بے قیمت سمجھے، اور اس سے جی نہ لگائے، اسے عبرت کی جگہ سمجھے، اسے اپنا مقصود و مطلوب نہ بنائے، بلکہ آخرت کو اپنا دائمی وطن، اصل مقام، حقیقی منزل سمجھے، اور وہاں کی کامیابی کے حصول کی فکر و محنت میں لگا رہے، احادیث میں آیا ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں اللہ کی نگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی، اور دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ و جیل ہے، یا سرائے خانہ ہے، ایک حدیث میں فرمایا گیا:

مَنْ أَحَبَّ دُنْيَاهُ أَضَرَّ بِآخِرَتِهِ، وَمَنْ أَحَبَّ آخِرَتَهُ أَضَرَّ بِدُنْيَاهُ،

ترجمہ: جو شخص دنیا کو اپنا محبوب و مطلوب بنائے گا وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کرے گا، اور جو کوئی آخرت کو محبوب بنائے گا وہ اپنی دنیا کا ضرور نقصان کرے گا، پس فنا ہو جانے والی دنیا کے مقابلہ میں باقی رہنے والی آخرت کو ترجیح دو۔  
 لہذا آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا ہی زہد کا تقاضا ہے، بعض حکماء کا مقولہ ہے کہ ”اگر دنیا فنا ہونے والے سونے سے بنی ہو اور آخرت باقی رہنے والے اٹھیکرے سے بنی ہو تب بھی عقل مند باقی کو فانی پر ترجیح دے گا۔

## (۴) اپنی زندگی کے اگلے دن کو شمار نہ کرے:

یعنی موت کو ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے رکھے، اور ہر آن یہ ذہن میں رکھے کہ اس کی موت قریب ہے، اور یہ تصور رہے کہ اگلا دن زندگی کا نہیں موت کا ہے، اور ہر عمل مابعد موت زندگی کے لئے انجام دے، یہی زہد و تقویٰ کی علامت ہے۔

## (۵) اپنا شمار مردوں میں کرے:

دنیا کی زیب و زینت سے دست کش ہونا اور آخرت کی ہر دم تیاری میں لگے رہنا لازمی طور پر اللہ سے ملاقات کی محبت بڑھاتا ہے، اور اللہ سے ملاقات کی محبت کا لازمی نتیجہ دنیا سے جانے اور آخرت میں پہنچنے کی خواہش ہے، اور یہ زہد کا اعلیٰ مقام اور آخری منزل ہے کہ انسان بس اللہ ہی میں فنا ہو جائے اور اس سے لقاء و وصل کا آرزو مند ہو جائے۔



# زبان کی حفاظت کی اہمیت

زبان انسان کے جسم کا بہت قیمتی اور اہم عضو ہے، اور قرآن وحدیث کے نصوص میں زبان کی حفاظت کا تاکید حکم بے شمار مقامات پر آیا ہے، زبان کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث نبوی سے لگایا جاسکتا ہے کہ:

”جب انسان صبح کرتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضاء زبان کے سامنے جھک جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، ہم تمہارے دم سے ہیں، اگر تم درست رہو گی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تم کجی اختیار کرو گی تو ہم بھی کج ہو جائیں گے۔“ (بخاری شریف)

زبان کی بے احتیاطیوں سے بچنا بیکار مشکل کام ہے، اسی لئے اس کی بیکار تاکید آئی ہے، اور زبان سے بے حد خائف اور محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی ہے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

”مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف زبان کی بے احتیاطیوں کا ہے۔“ (ترمذی شریف)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ دعا بھی شامل تھی کہ اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اپنے کان، آنکھ، زبان، دل اور منہ سبھی کے شر سے، احادیث میں مؤمن اور منافق کا ایک نمایاں فرق یہ بھی بیان ہوا ہے کہ مؤمن خاموش طبع محتاط اور بھلی بات بولنے والا ہوتا ہے، اور اس کی زبان درازیوں سے سبھی محفوظ رہتے ہیں، جب کہ منافق زبان دراز، بدگوار و شرّی ہوتا ہے۔

زبان کی آفات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، جس میں شرکیہ کلمات، جھوٹ، غلط فتویٰ، ناحق فیصلہ، غیر اللہ کے لئے نذر و منت، ناشکری، جھوٹی قسم، غیر اللہ کے نام سے قسم، تقدیر کا انکار، قولی بدعات، جھوٹی گواہی، تہمت، دوسرے کی پردہ دری اور معایب کی تشہیر، افترا پردازی، دشنام طرازی، چغل خوری، غیبت، افشاءِ راز، مذاق و استہزاء، گانا، ناحق مذاق، لعن طعن، نوحہ خوانی، بیجا تعریف، وغیرہ سبھی شامل ہیں، اور احادیث میں ان سب کی نام بہ نام صراحت کے ساتھ ممانعت اور مذمت کا مضمون جا بجا آیا ہے۔

زبان کی بے احتیاطیوں سے نجات کا طریقہ اور علاج یہ ہے کہ آدمی اللہ کی عظمت کا تصور کرے، اس کی قدرتِ کاملہ پر یقین کر لے، ثواب و عذاب کا علم اسے ہو، موت یاد کرے، جن آیات و احادیث میں زبان کی حفاظت کا حکم ہے انہیں بغور دیکھے اور پڑھے اور دل میں بٹھائے، نماز کا اہتمام کرے، دعاؤں میں لگ جائے، خاموشی اختیار کر لے، بے ضرورت نہ بولے، جب بولے بھلی بات بولے، اہل تقویٰ کی ہم نشینی اختیار کرے، حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے سرگرم ہو جائے، نیک کاموں میں مشغول ہو جائے، صبر کو اپنا شعار بنائے، اور خلوت گزینی کا عادی ہونے کی کوشش کرے۔

زبان کی حفاظت کا اہتمام کرنے اور احتیاط برتنے کے بے شمار فائدے ہیں، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اللہ کی خوشنودی میسر آتی ہے جو ہر مسلمان کا اولین مطلوب ہے، زبان کے سلسلے میں محتاط آدمی زبانِ نبوت میں سب سے افضل مسلمان ہے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا قریب ہے اور ان کا محبوب اور لاڈلا ہے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے جنت کی ضمانت لی ہے، اور عذاب الہی سے نجات کا مژدہ سنایا ہے، اور اسے افضل ترین مجاہد بتایا ہے۔

اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں، باہم

محبت بڑھتی ہے، معاشرتی زندگی پُر سکون ہوتی ہے، اور خود آدمی متنوع پریشانیوں اور مشکلات سے محفوظ ہو جاتا ہے، مزید براں وہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے اور محبوبیت الہی کے نتیجے میں محبوب ملائکہ بھی بن جاتا ہے اور پھر پوری روئے زمین میں اس کی مقبولیت و محبوبیت کا انتظام من جانب اللہ کر دیا جاتا ہے۔

دوسری طرف زبان کی بداحتیاطی کے بہت برے نتائج ہوتے ہیں، اللہ کا غضب اترتا ہے، زبان کے لحاظ سے غیر محتاط آدمی اللہ کا، فرشتوں اور انسانوں کا مغضوب ہو جاتا ہے، اور حدیث کے بموجب ایسے آدمی کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جہاں اسے چہرے کے بل دھکیل دیا جائے گا وہ عذاب قبر میں بھی مبتلا ہوگا، دنیا میں وہ پریشانیوں کا شکار ہوگا اور دوسروں سے اس کے تعلقات بگڑ جائیں گے۔

اسلاف میں سے کسی کا قول ہے کہ ”مؤمن بولتا کم اور کرتا زیادہ ہے، اسی لئے لغزشوں سے مامون رہتا ہے، اور منافق کرتا کم اور بولتا زیادہ ہے، اسی لئے وہ بہت لغزشوں میں مبتلا ہوتا ہے“ اور ”جسم انسانی میں دو ٹکڑے ہیں زبان اور دل، یہ دونوں اگر ٹھیک ہیں تو سب ٹھیک ہے، اور ان دونوں میں اگر فساد آ گیا تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے“۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ زبان کی احتیاط آدمی کے لئے ہر لحاظ سے خیر و برکت کی باعث اور مفید چیز ہے، اور زبان کی بے احتیاطی بے حد ضرر رساں اور مہلک چیز ہے۔



# قول و عمل کی ہم آہنگی

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے پہلے اور مختصر خطاب میں فرمایا تھا:

أَنْتُمْ الْيَوْمَ إِلَى إِمَامٍ فَعَالٍ أَحْوَجُ مِنْكُمْ إِلَى إِمَامٍ قَوَّالٍ.  
ترجمہ: آج تم کو کہنے والے امام سے کہیں زیادہ کرنے والے امام کی ضرورت ہے۔

حضرت عثمان کا یہ بلیغ جملہ ہمارے اس دور میں جیسی مطابقت رکھتا ہے، شاید ایسی مطابقت کسی دور میں نہ رہی ہوگی۔

قوالیت اور قوالیت پسندی ہم مسلمانوں کی بیماریوں میں سجد قابل فکر بیماری ہے، قول و عمل کا تضاد سب سے بڑا انسانی روگ ہے، یہ نفاق کی بدترین صورت ہے، قرآن میں یہود کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ.  
(البقرة: ۴۴)

ترجمہ: تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟  
مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ، كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ

أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ. (الصف: ۲-۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔

اس آیت میں صاف واضح کر دیا گیا ہے کہ ایک سچے مسلمان کے قول و عمل میں مکمل مطابقت ہونی چاہئے، جو کہے اسے کرے، جو کرنے کی نیت یا ہمت نہ ہو اسے زبان سے نہ کہے، قول و عمل کا تضاد بدترین خصلت ہے جو اللہ کی مبغوضیت کا سبب بنتی ہے، دوسروں کی اصلاح کے لئے سرگرمی اور اپنی اصلاح سے بے فکری خود را فضیحت دیگران را نصیحت کا انجام بیحد عبرتناک ہوتا ہے، حضرت اسامہؓ کی حدیث ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”قیامت کے دن ایک شخص کو لا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا تو آگ میں (شدتِ عذاب کی وجہ سے) اس کی آنٹیں باہر نکل آئیں گی، اہل دوزخ اس کے پاس جمع ہو کر کہیں گے تمہارا کیا حال ہے؟ کیا تم دنیا میں ہم کو اچھی باتوں کا حکم نہ دیتے تھے اور بری باتوں سے منع نہ کرتے تھے؟ وہ کہے گا کہ میں تم کو اچھی باتوں کا حکم تو دیتا تھا مگر خود ان پر عمل نہ کرتا تھا اور تمہیں بری باتوں سے روکتا تو تھا مگر خود ان کا ارتکاب کرتا تھا۔“ (بخاری شریف)

معلوم ہوا کہ قول و عمل کا تضاد جہنم کے المناک عذاب کو دعوت دیتا ہے، دوسروں کی فکر میں اپنی طرف سے بے فکری مسخرہ پن ہے، حدیث شریف میں ہے:

الْكَيْسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ. (ترمذی شریف)

ترجمہ: عقل مند وہ ہے جو اپنا محاسبہ کر لے اور آخرت کی ابدی زندگی کے لئے عمل کر لے، اور عاجز وہ ہے جس سے وہ جو اپنے نفس کو خواہش نفس کے تابع کر دے



اور (بد عملیوں کے ساتھ) اللہ سے (فلاح و نجات کی) آرزوئیں باندھے۔  
ایک حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

إِنَّمَا أَخَافُ عَلَىٰ هَذِهِ الْأُمَّةِ كُلِّ مُنَافِقٍ يَتَكَلَّمُ بِالْحِكْمَةِ  
وَيَعْمَلُ بِالْجَوْرِ. (شعب الایمان)

ترجمہ: مجھے اس امت پر ہر اس منافق سے اندیشہ ہے جو باتیں تو حکیمانہ  
کرے لیکن کام اس کے ظالمانہ ہوں۔

دانشمندانہ، فکر انگیز، حکمت پر مبنی، شیریں گفتگو ہو مگر عمل ظالمانہ و فاسقانہ ہو، زبان نبوت  
میں ایسے لوگ امت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید و تلقین  
ہے، ایک حدیث میں ایسے لوگوں کے بارے میں آیا ہے کہ ان کی زبانیں شکر اور شہد سے  
زیادہ شیریں مگر دل بھیڑیوں کی طرح خطرناک ہوں گے، اور ان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔  
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ ہر نبی کی امت میں ایسے  
ناخلف ہوتے ہیں جو قول و عمل کے تضاد اور حکم شریعت کے عصیان میں مبتلا ہوتے ہیں، ایسے  
لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد (ان کی غلط کاریوں پر نکیر) کرنے والا مؤمن کامل ہے، ان  
سے زبانی جہاد کرنے والا درمیانی درجہ کا مسلمان ہے، اور صرف دل سے جہاد کرنے والا (دل  
میں ان کے عمل کو برا سمجھنے والا) ناقص مؤمن ہے، اس کے بعد ایمان رائی کے دانے کے برابر  
بھی نہیں رہتا۔ (مسلم شریف)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیازی وصف قول و عمل کی ہم آہنگی اور قوتِ عمل تھا  
جس نے آپ کو ہر مرحلہ حیات میں کامیابی سے ہم کنار کیا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا  
نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کے جواب میں کہا تھا:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ. (ابوداؤد شریف)

ترجمہ: آپ کا اخلاق قرآن ہے۔

یعنی جو کچھ قرآن میں بصورتِ الفاظ ہے وہی آپ کی سیرت و حیات میں بصورتِ عمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتا پھرتا قرآن ہیں، آپ نے جو حکم بھی دیا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خود اس پر عمل کرے دکھایا، غریبوں کی امداد کا حکم دیا تو پہلے خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلایا، دشمنوں کو معاف کرنا سکھایا تو پہلے خود دشمنوں کو معاف کیا، نماز کا حکم دیا تو سب سے زیادہ نمازیں خود پڑھیں، زکوٰۃ کا حکم دیا تو اپنا سب مال راہِ خدا میں قربان کر دیا، قرآن نے اسی لئے آپ کی حیات کی اخلاقیات کو آپ کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ. (یونس: ۱۶)

ترجمہ: میں اس سے پہلے ایک مدت تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

پھر آپ کو خطاب کر کے فرمایا:

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ. (القلم: ۴)

ترجمہ: اے محمد! یقیناً آپ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

قول و عمل اور گفتار و کردار کی موافقت ہی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر میدانِ زندگی میں نمایاں کامیابی عطا کی، اور آج بھی کامرانی کی کلید یہی موافقت ہی ہے، اسلاف کی کامیابیوں اور ظفر مند یوں پر ناز کرنے والے اور اپنے آپ کو فراموش کرنے والے افراد سے اقبال کی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار

تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار



# قول و عمل

یہ آوازیں تو آئے دن سنائی پڑتی ہیں کہ مسلمان اس وقت اپنی بے حسی اور دنیا پرستی کی آخری حدیں عبور کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ بے حیثیت ہیں، مذہب بیزاری نے انہیں رسوا کر ڈالا ہے، یہ خیالات مفروضہ نہیں بلکہ حقائق ہیں جن کا مشاہدہ ہم یک چشم خود جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن اپنی ذمہ داری بھی محض حالات کے مشاہدہ اور تبصرہ پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ خیر امت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہمیں اپنی عملی زندگی کی اصلاح کے بعد اصلاح عام کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہونے کا ذمہ دار بھی بنایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے، ہر فرد اصلاح ذات کے بعد اصلاح عام میں دلچسپی لے گا تبھی معاشرہ سدھر پائے گا، ورنہ محض تنقید تو کچھ بھی سودمند نہیں ثابت ہو سکتی۔

مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے سے ہمارے سامنے تین طرح کے مسلمان طبقات ظاہر ہوتے ہیں، اب ہمیں ان ہی کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس طبقہ میں ہیں اور ہمیں کیا کرنا ہے؟ پہلا طبقہ تو ان حضرات کا ہے جن کے پاس زبانی دعوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، عمل سے ان کی زندگی بالکل خالی اور محروم ہے، بد قسمتی سے اکثریت اسی طبقہ کو حاصل ہے، ان کی دل ربا، لچھے دار اور جادو اثر گفتگو سے ہر خاص و عام متاثر ہو جاتا ہے، مسلمانوں کی حالت زار پر اظہار تاسف، فلسفہ اسلام کی تشریح اور دانشمندانہ تجاویز پر مشتمل باتیں ان کی زبانوں سے ہمہ وقت نکلتی رہتی ہیں مگر ان کی اپنی عملی زندگی انتہا درجہ مایوس کن نظر آتی ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ خود اپنی ذمہ داریاں صرف قول تک محدود باور کرتے ہیں، اور

عملی زندگی کو پرسنل معاملہ کہہ کر ٹال جاتے ہیں، ہمارے معاشرہ میں دعوتی کام کرنے والے افراد کا یہی المیہ ہے کہ وہ عملی زندگی میں ناکام ہیں، ظاہر ہے کہ جب قول عمل کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہ ہو تو اس کی تاثیر کہاں ظاہر ہو سکتی ہے؟ اللہ نے خود اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا:

”اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔“

(الصّف: ۳)

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کی پیشین گوئی کی ہے جو شکر سے زیادہ میٹھی زبان رکھیں گے مگر ان کے دل بھیڑیوں جیسے ہوں گے۔

دوسرا طبقہ ان حضرات کا ہے جو خاموش عمل کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے یہاں قول کا خانہ نہیں، صرف عمل ہی عمل ہے، یہ طبقہ بجائے خود درست روش پر ہے مگر اس کا فائدہ عموماً متعدی نہیں ہو پاتا لازم رہ جاتا ہے، اس لئے شخصی پرسنل معاملات کی حد تک تو یہ نقطہ نظر سید حکیمانہ ہے اور مفید ہے مگر اجتماعی و دعوتی امور میں صرف خاموش عمل ہی مؤثر نہیں ہے بلکہ مؤثر اظہار و بیان اور قول بھی اس کا لازمی جزء ہے۔

تیسرا طبقہ ان حضرات کا ہے جو قول و عمل دونوں کے جامع ہیں، موجودہ دنیا میں اسی طبقہ کی ضرورت ہے، انبیاء و مجددین، داعیان و مصلحین نے ہر دور میں ایسے ہی افراد تیار کئے ہیں اور اس وقت بھی ان ہی کو تیار کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں جب غیر اسلامی فلسفہ زندگی اور مادہ پرستانہ فکر پوری قوت سے پھیلائی جا رہی ہے ایسے قول و عمل کے جامع افراد کی ضرورت روز افزوں ہے جو اپنے عمل کی اصلاح کے بعد عوام کی اصلاح کے لئے میدان میں آئیں۔

ہم جب بھی مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیں تو پہلے اپنے آپ کو بھی دیکھیں کہ کیا ہم اس تیسرے طبقہ میں شامل ہیں؟ اگر خدا نخواستہ ہم شامل نہیں ہیں تو اصلاح عام کے کام

کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اس معیار پر کھرا ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ قول و عمل کی جامعیت ہی وہ امتیازی وصف ہے جو فاتح عالم اور مؤثر ترین ثابت ہوتا ہے، ماضی میں ہماری کامیابی و نیک نامی کی ساری داستانوں کے پس پردہ یہی عامل کار فرما رہا ہے، اور آج بھی ہماری کامیابی کی ضمانت اسی امتیازی وصف کو اپنانے ہی میں ہے۔



# خوفِ خدا کی اہمیت

قرآنی تعلیمات اور نبوی ہدایات میں متعدد مقامات پر خوفِ خداوندی اور خشیتِ ربانی کی فضیلت اور اس کی تاکید و تلقین کا مضمون ملتا ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ جس بندے میں خوفِ خدا پیدا ہو جاتا ہے وہ دنیوی و اخروی ہر نوع کی فلاح اور کامرانی کا مستحق ہو جاتا ہے۔ علماء کے بیان کے مطابق خوف کی کئی قسمیں ہیں، علامہ ابن رجب حنبلی کے بقول مطلوب اور واجبی خوف وہی ہے جو فرانس کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب پر آمادہ کرے، اور اگر خوف اتنا زیادہ ہو جائے کہ وہ دلوں میں نفل عبادتوں کی انجام دہی، معمولی گناہوں اور خلاف اولیٰ امور سے اجتناب اور ضرورت سے زائد مباح امور سے پرہیز کا باعث بن جائے تو یہ قابلِ تعریف بات ہے، لیکن اگر خوف اس قدر بڑھ جائے کہ بیماری یا موت یا دائمی فکر اور اللہ کے محبوب اعمال کی انجام دہی سے رک جانے کا سبب بن جائے تو یہ خوف قابلِ تعریف نہیں بلکہ قابلِ مذمت ہے۔ (التخويف من النار: ۱۸)

علامہ ابن القیم نے لکھا ہے کہ:

”سچا اور قابلِ تعریف خوف وہ ہے جو انسان اور محرماتِ الہیہ کے درمیان حائل ہو جائے، اگر خوف اس سے زائد ہو جائے تو اس میں مایوسی اور ناامیدی کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وہ قابلِ مذمت ہے، ابو عثمان کے بقول ظاہری و باطنی گناہوں سے اجتناب ہی سچا خوف ہے، اور بقول امام ابن تیمیہ قابلِ تعریف خوف وہ ہے جو حرام امور سے روک دے اور بچائے۔“ (مدارج السالکین: ۱/۵۱۴)

امام غزالی نے خوف کی تین قسمیں کی ہیں: (۱) ناقص (۲) ضرورت سے زائد (۳) معتدل۔

خوف ناقص کی مثال عورتوں کی رقت ہے کہ وہ قرآن کی ایک آیت سن لیتی ہیں تو ان پر گریہ طاری ہو جاتا ہے اور اشک رواں ہو جاتے ہیں، اسی طرح خوفناک چیز دیکھ لیتی ہیں تو رونے لگتی ہیں، پھر اس کے بعد غفلت طاری ہو جاتی ہے، یہ خوف ناقص، بے فائدہ، بے نتیجہ اور بے اثر ہوتا ہے۔

اور ضرورت سے زائد خوف وہ ہے جو حد اعتدال سے تجاوز کر کے مایوسی کی حد میں داخل ہو جائے اور عملی قوت ختم اور کمزور کر دے، معتدل خوف وہ ہوتا ہے جو اعضاء کو معاصی سے روکتا اور طاعات کا پابند کرتا ہے۔ (احیاء العلوم: ۱۵۶/۴)

علماء کا کہنا ہے کہ رونے اور آنکھ سے اشک پونچھنے والا خائف نہیں ہے، خائف تو وہ ہے جو گناہوں کو اللہ کی سزا کے ڈر سے چھوڑ دے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو کسی چیز سے ڈرتا ہے وہ اس سے دور بھاگتا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اللہ کی طرف بھاگتا ہے، خوف الہی کی پہچان یہی ہے۔

امام غزالی نے خوفِ خدا کی اہمیت کے ذیل میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ”شہواتِ نفسانیہ کا قلع قمع کسی اور تدبیر سے اتنا ممکن نہیں جتنا خوفِ خداوندی کی تدبیر سے ممکن ہے، خوفِ خدا ہی شہوتِ نفس کو جلانے والی آگ اور ختم کرنے والا زہر ہے، خوف جس قدر زیادہ اور پختہ ہوگا شہوتیں اتنی ہی زیادہ ختم ہوں گی، معاصی سے اتنا ہی زیادہ بچاؤ ہوگا اور طاعات کا اتنا ہی زیادہ شوق اور اہتمام ہوگا، خوف کی اہمیت و عظمت تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، کیونکہ عفت مآبی، خدا ترسی، ورع و پرہیزگاری اور مجاہدہ جیسے اللہ کا قرب عطا کرنے والے اعمال و اوصاف صرف خوفِ خدا کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ (احیاء العلوم: ۱۰۶/۴)

خوف خدا کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے آخرت میں دشواریوں سے بے خوفی اور امن حاصل رہے گا، ارشادِ نبوی ہے:

”اللہ فرماتا ہے کہ میری عزت و جلال کی قسم! میں اپنے کسی بندے کے لئے دو خوف یا دو امن جمع نہ کروں گا، اگر وہ دنیا میں مجھ سے بے خوف رہا تو قیامت میں میں اسے خوف میں مبتلا کر دوں گا، اور اگر وہ دنیا میں مجھ سے ڈرتا رہا تو قیامت میں میں اسے بے خوف بنا دوں گا۔“ (بزار)

قرآنِ کریم میں یہی بات بار بار کہی گئی ہے، مثلاً ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ.  
(الدخان: ۵۱)

ترجمہ: اہل تقویٰ امن کی جگہ میں ہوں گے۔

اہل جنت سے کہا جائے گا:

أَدْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ.  
(الحجر: ۴۶)

ترجمہ: تم جنت میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

ارشادِ باری ہے:

أَفَمَنْ يُلْقَىٰ فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمَّنْ يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

(حم السجدة: ۴۰)

ترجمہ: آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو

قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟

وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ.  
(النمل: ۸۹)

ترجمہ: اور (اہل ایمان کامل) اس دن (قیامت میں) گھبراہٹ سے

محفوظ ہوں گے۔ یعنی بے خوف ہوں گے۔



اگر انسان کا دل دنیا میں اللہ کے خوف سے لرزتا ہے تو اس خوف کا ثمرہ قیامت میں بے خوفی، امن اور جنت کی شکل میں ملے گا اور وہاں اہل جنت اپنا یہ حال بیان کریں گے کہ:

إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ، فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَّانَا عَذَابَ

السَّمُومِ. (الطور: ۲۶-۲۷)

ترجمہ: ہم دنیا میں خائفانہ زندگی گزارتے تھے، اس کے ثمرے میں اللہ نے ہم پر فضل فرمایا ہے اور ہم کو آتش سوزاں کے عذاب سے محفوظ فرمایا ہے۔

اور اگر انسان کا دل دنیا میں اللہ سے اور آخرت کی باز پرس سے بے خوف ہے تو قیامت میں اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ کانپ رہا ہوگا اور بالآخر لقمہٴ جہنم بنے گا، روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان کے پاس آئے جو نزاع کے عالم میں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! متضاد کیفیت ہے، اپنے گناہوں کا خوف بھی ہے اور اللہ کی رحمت کی امید بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ:

لَا يَجْتَمِعَانِ فِي قَلْبِ عَبْدٍ فِي مِثْلِ هَذَا الْمَوْطِنِ إِلَّا أُعْطَاهُ اللَّهُ مَا يَرْجُو، وَآمَنَهُ مِمَّا يَخَافُ.

(ترمذی شریف)

ترجمہ: یہی ایمان ہے، جس بندہٴ مومن کے دل میں اس جیسے (مشکل) موقع پر خوف ورجاء دونوں جمع ہو جاتے ہیں تو اللہ معاملہ یہ کرتا ہے کہ اسے اس کی امید کے مطابق اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور اسے خوف سے امن میں لے آتا ہے۔



# خدا ترسی

خوف خدا اور فکر آخرت وہ چیزیں ہیں جو ایمان کے بعد حیات انسانی کی اصلاح، آراستگی اور کامیابی میں سب سے اہم اور کلیدی رول ادا کرتی ہیں، اللہ کا خوف اور اس کے عذاب و عقاب اور گرفت سے ڈرنا ہی انسان کی نجات اور فلاح کی اساس ہے، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ کے خوف سے کسی بندہ کے جسم کا رونکلا کھڑا ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے پرانے بوسیدہ درخت کے پتے جھڑتے ہیں، ایک دوسری حدیث میں اللہ کے خوف اور اس کی ہیبت سے آنکھوں کے اشکبار ہونے اور آنسوؤں کے ڈھلک کے رخسار پر آجانے پر نارِ جہنم کے حرام ہو جانے کی اہل ایمان کو بشارت دی گئی ہے، قرآن کریم میں بھی معیارِ فضیلت خدا ترسی ہی کو قرار دیا گیا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ. (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: تم میں سب سے معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سب

سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے پوچھا ”تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟“ انہوں نے فرمایا: کیا کبھی آپ کا گزر رخا درار ہوں سے ہوا ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: بارہا میرا گزر ہوا ہے، حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا: ایسے میں آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: میں نے اس میں پوری کوشش صرف کر ڈالی کہ کانٹوں سے الجھے بغیر سلامتی سے باہر نکل آؤں، اس پر حضرت ابیؓ نے فرمایا: بس یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔

تقویٰ یہی ہے کہ گناہوں سے اپنا دامن نہایت احتیاط اور ہوش مندی سے بچالیا جائے، قرآن کی مختلف آیات میں خدا ترسی کا حق ادا کرنے، حسب الامکان اللہ سے ڈرنے، ہمیشہ لرزاں و ترساں رہنے، خود احتسابی، زندگی کی آخری سانس تک خوف خدا کو ملحوظ رکھنے، اور احکام اسلام کو انجام دینے کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔

اور پھر جن دلوں میں خوفِ خدا جاگزیں ہو جاتا ہے، ان کے لئے جنت، انعامات الہی، رضائے خداوندی کی بشارتیں ہیں، خدا ترسی کی برکتوں، ثمرات اور فوائد کا کوئی شمار نہیں، ایک فائدہ یہی ہے کہ منجانب اللہ آسمانی اور زمینی برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، مشکلات و مصائب میں نجات کی راہ مل جاتی ہے، بے سان و گمان رزق عطا ہو جاتا ہے، ناامیدی میں امید کی کرن نمودار ہوتی ہے، مایوسی کے عالم میں خوش خبری ملتی ہے، حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت، قوت اور شان پیدا ہو جاتی ہے، اللہ کی اعانت و امداد نصرت و حفاظت ہمہ وقت سایہ فگن رہتی ہے، دشمن کی گزند سے پناہ رہتی ہے، خطاؤں اور لغزشوں کے بدل کے طور پر اعمالِ حسنہ کی منجانب اللہ توفیق عطا ہوتی ہے، آخرت میں تمام گناہوں کی مغفرت کا وعدہ بھی ہے، اللہ کی معیت نصیب ہوتی ہے۔

خدا ترسوں کے نمایاں اوصاف و علامات یہ ہوتی ہیں کہ وہ کامل الایمان ہوتے ہیں، تمام طاعات کی انجام دہی کرتے ہیں، وعدہ اور عہد وفا کرتے ہیں، صبر و استقلال کے جوہر سے آراستہ ہوتے ہیں، خوشی و ناخوشی، تنگی و فراخی، کشاکش، و کشائش، بیماری و تندرستی، سفر و حضر، شب و روز، صبح و شام ہر موقع و مرحلہ پر وہ راست باز، عبادت گزار اور اطاعت شعار ہوتے ہیں، غصہ پی جاتے ہیں، تحمل سے کام لیتے ہیں، اپنی خطاؤں پر نادم و پشیمان اور بصدق قلب تائب ہوتے ہیں۔

خدا ترسی اور تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہوتا ہے، خدا ترس وہی ہے جس کا دل اللہ

کے خوف سے لرزتا، تڑپتا اور دھڑکتا رہے اور اس دل کے لرز نے کا اثر ظاہری اعمال پر اس صورت میں نمایاں ہو کہ نیک اعمال ہی ہوں، اور سوءِ اتفاق خطائیں ہو بھی جائیں تو فوراً متنبہ اور آگاہی ہو اور توفیقِ توبہ ہو۔

خدا ترسی کی دولت سب سے قیمتی دولت ہے، جسے یہ دولت مل گئی اس کے لئے دنیا کی تمام چیزیں بے مایہ اور ہیچ ہو جاتی ہیں۔



# دین پر جماؤ

احادیثِ نبویہ میں قربِ قیامت میں آنے اور چھانے والے فتنوں کی مکمل اور مفصل پیش گوئی ملتی ہے، اور یہ وضاحت ملتی ہے کہ فتنوں کے غلبے کے دور میں دین پر جماؤ اور شریعت پر استحکام کا ثواب دوسرے ادوار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، مشکل اور ناگفتہ بہ حالات میں جہاں ایمان اور عملِ صالح کی راہ میں خطرات اور روڑے ہوں، دشمنانِ دین اہل حق کی مذہبی آزادی کے لئے بالکل تیار نہ ہوں اور ہر ممکن کوشش سے حق کی راہِ مسدود کرنے کے درپے ہوں، ان حالات میں جو بندہ خدا صراطِ مستقیم پر گامزن رہے اور اس کے قدمِ جادہ حق پر استوار رہیں، اس کے دین کی قوت، یقین کی پختگی اور استقامت وثابت قدمی اللہ کی نگاہ میں بڑی قدر و منزلت رکھتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ:

الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ.

(مسلم شریف)

ترجمہ: طاقتور مسلمان (ایمانی طاقت اور جسمانی قوت کا حامل) اللہ کی

نگاہ میں کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور محبوب و پسندیدہ ہے۔

احادیث ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دو فتن میں دین پر جے رہنے والے کو پچاس مسلمان کے برابر اجر ملتا ہے، ابو امیہ شعبانی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ثعلبہ حشنی سے پوچھا کہ اس آیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس میں اہل ایمان سے کہا گیا ہے:

عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ، لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ، إِلَى اللَّهِ

مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا۔ (المائدة: ۱۰۵)

ترجمہ: اپنی فکر کرو، تم اگر ہدایت یافتہ ہو تو گمراہ لوگ تم کو بالکل نقصان نہ پہنچا سکیں گے، تم سب کو لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے۔

حضرت ابو ثعلبہ نے فرمایا کہ میں نے اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

اِئْتَمِرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتَّىٰ إِذَا رَأَيْتُمْ شُحَاً مُطَاعاً وَهَوًى مُتَّبِعاً وَدُنْيَا مُؤَثَّرَةً، وَاعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ، فَعَلَيْكَ نَفْسُكَ، وَدَعْ أَمْرَ الْعَوَامِّ، فَإِنَّ وَرَاءَ كُمْ أَيَّامَ الصَّبْرِ، فَمَنْ صَبَرَ فِيْهِنَّ قَبِضَ عَلَى الْجَمْرِ، لِلْعَامِلِ فِيْهِنَّ أَجْرُ خَمْسِينَ رَجُلًا يَعْمَلُونَ مِثْلَ عَمَلِهِ۔ (ترمذی شریف: ۳۰۶۰، ابن ماجہ: ۴۰۴۱)

ترجمہ: تم نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو، یہاں تک کہ جب تم یہ دیکھ لو کہ بخل و حرص کی راہ پر لوگ چل رہے ہیں، خواہش نفس کی پیروی ہو رہی ہے، دنیائے دون کو آخرت پر ترجیح دی جا رہی ہے، ہر صاحب رائے اپنی رائے پر خوش (اور مصر ہو کر اسی کو حرفِ آخر قرار دینے پر تلا ہوا) ہے، اور فساد و بگاڑ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا مقابلہ وازالہ اور روک تھام تمہارے بس سے باہر ہے تو پھر تم اپنی (اور اپنے ایمان کے بچاؤ کی) فکر میں لگ جاؤ، دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ دو (ان کے پیچھے مت پڑو) آگے چل کر (فتنوں اور شہائد کے) ایسے ایام آنے والے ہیں جن میں دین پر جماؤ انگارہ ہاتھ میں لینے کی طرح (مشکل اور مصائب سے پر) ہوگا، ان حالات میں دین اور عمل صالح پر قائم رہنے والے کو اس جیسا

عمل کرنے والے پچاس افراد کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا۔  
 آج امت مسلمہ داخلی و خارجی فتنوں سے گھری ہوئی ہے، کفر کی قوتیں باہر سے،  
 نفاق کی قوتیں اندر سے اور نفس کی شہوتیں دل کے اندرون سے پوری امت پر حملہ آور ہیں،  
 مذکورہ حدیث میں امت کے لئے بہت کچھ سامانِ تسلی اور موجودہ صورتحال کا لائحہ عمل موجود  
 ہے، امت اگر اپنا ایمانی تحفظ چاہتی ہے تو اسے دین کی طرف لوٹنا ہوگا، یہ حدیث امت کے  
 لئے بشارتِ عظمیٰ ہے جس میں وارد ہوا ہے:

عِبَادَةُ فِي الْهَرَجِ كَهَجْرَةِ إِلَى. (مسلم شریف)

ترجمہ: فتنے کے زمانے میں اللہ کی (پر خلوص) عبادت میری (رسول  
 اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی) طرف ہجرت کے (اجر و ثواب میں) برابر ہے۔



# انسان کی ناشکری

انسان پر خدائے ذوالجلال کی نعمتیں شمار سے باہر ہیں، اللہ نے انسان کو سب سے مکرم بنایا ہے، اسے بحر و بر میں سواریاں عطا کی ہیں، اسے پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا ہے، اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی ہے، خوبصورت سانچے اور بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے، اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسے اس کائنات کا سب سے زیادہ قیمتی، قابل احترام، لائق محبت اور مستحق حفاظت وجود بنایا ہے، اسے اس بزمِ عالم کا صدر نشین بنایا ہے، اس کا رتبہ اتنا برتر کیا ہے کہ اس سے اوپر صرف خدا کی ہستی رہ جاتی ہے، قرآن کی زبان میں انسان اللہ کا نائب ہے، یہ پوری دنیا اور پورا کارخانہ عالم اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، کائنات کی اشیاء کو اس کی خدمت میں لگا دیا گیا ہے، زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں، اللہ نے اپنی ظاہری و باطنی، عیاں و نہاں، کھلی چھپی تمام نعمتیں انسان پر تمام کر دی ہیں، سب اشیاء اس کی تابع و خادم بنائی گئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی نعمتوں کو شمار ہی نہیں کر سکتا، اس کی نعمتوں کا بحر بے کراں ہے، اس کا کوئی ساحل و کنارہ ہی نہیں، ہر آن اس کی نعمت و فضل کی بارش انسان پر برستی رہتی ہے:-

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کارند

تا تو نمانی بکف آری و غفلت نہ خوری

اللہ نے انسان کو اپنا کنبہ قرار دیا ہے، انسانیت کا حد درجہ احترام اللہ کی شریعت میں ملحوظ رکھا گیا ہے، ان تمام بے پایاں نعمتوں کا شکر اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب انسان اپنے



مقصدِ تخلیق یعنی عبادت و بندگی سے کسی لمحہ غافل نہ ہو، لیکن دوسری طرف اکثر انسانوں کی صورت حال بالکل الٹی ہے، قرآن کی زبان میں:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللَّهِ كُفْرًا، وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ

الْبَوَارِ.

(ابراہیم: ۲۸)

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا اور اپنے ساتھ اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا۔

ایک طرف اللہ نے ہر طرح کی نعمت دی اور:

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ، وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً، فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلُكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبِينَ، وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ، وَأَتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ، وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ.

(ابراہیم: ۳۲-۳۴)

ترجمہ: آسمان و زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لئے طرح طرح کے پھل دیئے، اس نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا، سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات و دن کو تمہارے لئے مسخر کیا اور تمہیں وہ سب کچھ دیا جو تم نے مانگا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے

انصاف اور ناشکرا ہے۔

فطرت کی ہر مانگ، زندگی کا ہر مطلوب اور بقاء و ارتقاء کے تمام وسائل فراہم و مہیا کئے جانے کے باوجود یہ انسان ناشکری اور احسان فراموشی کی آخری حدوں تک پہنچ چکا ہے، انسان کا اپنا وجود ایک عالم اصغر ہے، اس کے تمام اعضاء، جسم کے ہر جوڑ اور ہر رگ وریشہ میں اللہ وحدہ لا شریک لہ کی لامتناہی نعمتوں کا ایک خزانہ مخفی و پنهان ہے، لیکن انسانی طبیعت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا تب تک اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا اور ناشکری کرتا جاتا ہے، قرآن نے انسان کو اسی کفرانِ نعمت کی طرف بارہا متوجہ کیا ہے۔

نعمتوں کی ناقدری، کفرانِ نعمت، احسان ناشناسی، معصیت اور بے راہ روی کے نتائج انسان کو مصائب، مشکلات، حادثات اور اذیتوں کی شکلوں میں بھگتتے پڑتے ہیں، قرآن کہتا ہے:

وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً، يَأْتِيهَا رِزْقُهَا  
رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ، فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ، فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ  
وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ.

(النحل: ۱۱۲)

ترجمہ: اور دیکھو کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی، ایک بستی تھی جہاں ہر طرح کا امن تھا، ہر جگہ سے سامانِ رزق آتا رہتا تھا اور ہر شخص فراغت سے کھاتا رہتا تھا، لیکن پھر ایسا ہوا کہ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے بھی ان کے کاموں کی پاداش میں انہیں نعمتوں سے محروم کر دیا، تنعم کی جگہ فاقہ اور امن کی جگہ خوف ان پر چھا گیا۔

دنوی نتائج بد کے سوا اخروی نتائج کہیں زیادہ بدتر ہوں گے، قرآن کے بقول:

لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ، وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ، ذَلِكَ

يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ، يَا عِبَادِ فَاتَّقُوا. (الزمر: ۱۶)

ترجمہ: ان پر آگ کی چھتریاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی، یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، تو اے بندو! میرے غضب سے بچو۔

وجودِ انسانی پر یہ خدائی لامتناہی نعمتیں دعوتِ شکر و عمل دیتی ہیں، یہ بندوں کو خدا کا پیغام سناتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اللہ کا کرم اور فیض بالکل عام ہے، اس کی ہدایت سب کو یکساں ہے مگر اکثر افراد اس دعوت اور صدا پر ذرا بھی کان نہیں دھرتے اور ناشکری و بے عملی میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں جس کا خمیازہ نعمتوں سے محرومی کی شکل میں بھگتنا پڑتا ہے:۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں  
راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں



# کامل انسان اور مکمل انسانیت

قرآن کریم فرماتا ہے کہ:

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ، وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا.

(بنی اسرائیل: ۱۱)

ترجمہ: انسان شر اسی طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے، انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا.

(بنی اسرائیل: ۶۷)

ترجمہ: انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا.

(بنی اسرائیل: ۱۰۰)

ترجمہ: واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْئٍ جَدَلًا.

(الکہف: ۵۴)

ترجمہ: انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

قَتَلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ.

(عبس: ۱۷)

ترجمہ: خدا کی مار ہو انسان پر کیسا ناشکرا اور منکر حق ہے وہ۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ.

(الانفطار: ۶)

ترجمہ: اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے جس نے تجھے پیدا کیا۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيْطُوغِي، أَنْ رَأَاهُ اسْتَغْنَى، إِنَّ إِلَى رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ.

(العلق: ۶-۸)

ترجمہ: انسان سرکشی کرتا ہے اس بناء پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے حالانکہ پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ.

(العادیات: ۶)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ.

(الهمزة: ۳)

ترجمہ: انسان سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا، إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ.

(المعارج: ۱۹-۲۳)

ترجمہ: انسان کم ہمت، تھردلا، بے صبرا پیدا کیا گیا ہے جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے مگر وہ نمازی جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً، فَرِحَ بِهَا، وَإِنْ تُصِيبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنْسَانَ كَفُورٌ.

(الشوری: ۴۸)

ترجمہ: انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو وہ سخت ناشکرا بن جاتا ہے۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي

أَكْرَمَنْ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ.

(الفجر: ۱۵-۱۶)

ترجمہ: مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ، وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ.

(حم السجدة: ۵۱)

ترجمہ: انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے، اور جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ ضَعِيفًا.

(النساء: ۲۸)

ترجمہ: انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا، فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ.

(یونس: ۱۲)

ترجمہ: اور جب انسان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت میں ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔

قرآن نے مختلف مقامات پر انسان کے طرزِ عمل اور نفسیات کا یہ نقشہ بھی کھینچا ہے؛ لیکن یہ اوصاف عام طور پر انسان کی اس نوع کے ہیں جو جو ہر ایمان سے محروم ہو یا ایمان کے رسمی اظہار کے بعد اپنی پوری زندگی خلافِ ایمان اعمال میں بسر کرتی ہو، جو انسان ایمان

اور عمل صالح کے ذریعہ اپنی انسانیت کو آراستہ اور درست نہ کرتا ہو وہ ہر طرح کی برائیوں میں ملوث ہوتا ہے اور وہ قرآنی تعبیر کے مطابق جانور بلکہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوتا ہے، جو انسان ننگ انسانیت ہو تو وہ کتے اور گدھے سے بھی زیادہ بے حیثیت ہوتا ہے، پھر نہ دنیا اس کی ہے اور نہ آخرت۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے:

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.

(العصر)

ترجمہ: زمانے کی قسم! انسان درحقیقت خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

انسان صحیح معنوں میں وہ ہے جو اپنا مقصد تخلیق ہر لمحہ پیش نظر رکھ کر اسی میں لگا رہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا ہر قدم جادہ مستقیم پر استوار رہے، ایسے ہی انسان کو خساروں اور ہلاکتوں سے بری قرار دیا گیا ہے، لیکن وہ انسان جو ناشکری، بے صبری، انکار حق، کم ہمتی، جھگڑے، سرکشی، عناد، مادیت، زر پرستی، اتباع ہوی، بخل، اکڑ، کبر، احسان فراموشی، محسن کشی اور غدر و خیانت جیسی تمام لعنتوں میں اسیر ہو اور جو اپنی خساست و دناءت کی وجہ سے مذہب، قوم، وطن سب کے لئے ننگ و عار بن چکا ہو وہ صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

کیا عقل سلیم اس کی روادار ہو سکتی ہے کہ اسے انسانوں کے زمرہ میں شامل کیا جائے جو اپنے بھائیوں کو بھی اپنی سفاکی اور وحشیت کا نشانہ بناتا ہو، جو ہزاروں معصوموں کی جانیں لے کر ان کے تڑپتے لاشوں پر ہنستا اور ٹھوکریں مار کر گزر جاتا ہو، جو معصوم بچوں کے منہ سے نوالے چھین کر ان کے تڑپنے کا منظر دیکھتا اور خوش ہوتا ہو، اور جو بچوں کو یتیم، خواتین کو بیوہ اور ماؤں کو لاولد کر کے چین پاتا اور رقص کرتا ہو، جو امانت و دیانت اور عہد و وعدہ کی پاسداری

سے بالکل نا آشنا ہو، جو اپنے منافع کے لئے دوسروں کے ہر نقصان کو انگیز کرتا ہو اور جو اپنے خسیس مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر حد تجاوز Cross کرنے میں کوئی باک نہ رکھتا ہو؟

موجودہ دنیا میں ان نام نہاد انسانوں کی کثرت ہے جو اپنے اعمال و اوصاف میں شیاطین سے مشابہ ہیں، کوئی دین کے نام پر دنیا طلبی میں لگا ہوا ہے، کوئی وطن پرستی کے نام پر وطن فروشی کر رہا ہے، کوئی تجارت کا سہارا لے کر چوری کر رہا ہے، کوئی محبت کا دم بھر کر چھری چلا رہا ہے، کوئی معلم بن کر تعلیم کے اعلیٰ اقدار کو ملیا میٹ کر رہا ہے، کوئی ڈاکٹر بن کر خدمتِ خلق کے نام پر لوٹ مار کر رہا ہے، کوئی اپنی بیوی سے خیانت کر رہا ہے، کوئی اپنے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خفیہ آشنائی میں مصروف ہے۔ بدکرداری کے بے شمار نمونے اور لامتناہی فہرست ہے، ہر ایک دوسرے کو کھانے اور ڈسنے کے چکر میں ہے، انسان اب ایسا بھیڑیا بن گیا ہے جس سے جنگل کے بھیڑیے شرماتے ہیں۔

نئی تہذیب و تمدن کے علمبرداروں میں یہ بدکرداری کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے، اور ہر صاحب بصیرت انسان ایک لمحہ میں اس کا اندازہ کر لیتا ہے، حکیم مشرق اقبال کا بیان ہے کہ میخانہ مغرب میں ان کو دردِ دسر کے سوا کچھ نہ ملا اور دانشمندانِ فرنگ کی ہمراہی میں گذرے ہوئے دن سے زیادہ بے کیف، بے سوز اور بے نور شب و روز ان کی پوری زندگی میں کبھی نہیں آئے۔

مے از مے خانہ مغرب چشیدم  
بجانِ من کہ دردِ سر خریدم  
نشستم با نکویانِ فرنگی

ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

قرآن کے بیان کے مطابق جب انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی عبادت اور بندگی ہے تو پھر ایمان و عبادت سے انحراف رکھنے والا ہر عمل انسان کو اس کے مقصدِ حیات سے غافل اور دور کرتا چلا جائے گا، اور مقصد سے منحرف انسان کیسے صحیح معنوں میں انسان کہلا سکتا ہے؟



اس مقصد سے دوری کے بعد انسان خواہ کوئی بھی عمل کر لے، کوئی بھی ایجاد کر لے، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر لے یا چاند پر ٹھکانہ کر لے مگر وہ ہر آن انسانیت سے دور ہوتا جائے گا، نہ وہ اپنے خدا سے قریب ہو سکے گا، نہ وہ اپنی زندگی کی شب تار یک کو سحر کر سکے گا اور نہ وہ کسی کامیابی سے ہم کنار ہو سکے گا۔

مقصد حیات سے دوری اور اللہ سے قطع تعلق کی صورت میں انسان اس وقت کائنات کی سب سے بدترین مخلوق رہتا ہے، اور آخرت میں بھی وہ سب سے زیادہ رسوا ہوگا۔ اور مقصد حیات پر مضبوطی سے جماؤ اور اللہ سے تعلق کے نتیجہ میں انسان اس کائنات کی اشرف ترین مخلوق ہوتا ہے اور آخرت کی ساری نعمتوں سے بھی سب سے زیادہ وہی بہرہ مند ہوگا۔ مقصد حیات پر جماؤ اسی صورت میں پیدا ہوگا جب ان اوصاف کا مصداق بننے سے اپنے کو بچایا جائے جو قرآن کے حوالہ سے آغاز میں ذکر کئے گئے، ہماری مشکل یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات سے ہمارا عمل بالکل مختلف ہے اور یہی دین و دنیا میں ہماری پسماندگی کا سبب ہے، اقبال کے بقول مسلمانوں کے دلوں میں اب زندگی کا شرارہ گل ہو رہا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ختم ہو چکا ہے:۔

در دل او آتش سوزندہ نیست

مصطفیٰ در سینہ او زندہ نیست

اور اس افسوسناک صورتحال کا خاتمہ مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں، ناامیدی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق ایمان، عمل صالح، صبر و حق کی تلقین کے وہ اوصاف اختیار کر لئے جائیں جو ہر خسارہ سے نجات کے ضامن ہیں ۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے

ذرا غم ہو تو یہ مٹی بہت زر خیز ہے ساقی



# تصنع و اسراف اور سادگی

تاریخ کی کتابوں میں وزیر ”ابن الفرات“ کے بارے میں یہ ملتا ہے کہ اسراف اور عیش پرستی میں وہ اتنا زیادہ ڈوب گیا تھا کہ اس کے کھانے کے وقت دسترخوان پر تیس سے زائد چمچے سونے کے رکھے جاتے تھے اور وہ ایک چمچے سے ایک لقمہ سے زیادہ نہ کھاتا تھا، ہر لقمہ پر چمچ بدلنا تھا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کے بارے میں آتا ہے کہ بسا اوقات اس کے دسترخوان پر تین سو سے زائد کھانے کی اقسام و انواع ہوتی تھیں وہ سب کو چکھتا تھا، دسترخوان لگانے اور اٹھانے پر دسیوں ملازم مامور تھے۔

خلیفہ عباسی مقتدر باللہ کی والدہ کا یہ واقعہ تواریخ میں مذکور ہے کہ اس کا جوتا بے حد قیمتی کپڑوں سے بنایا جاتا تھا، وہ کپڑے پہلے سائز کے حساب سے کاٹ لئے جاتے تھے پھر انہیں مشک و عنبر میں ملایا جاتا تھا اور پھر جوتا بنایا جاتا تھا، اور یہ قیمتی جوتا وہ چند روز استعمال کر کے ملازموں کو دے دیا کرتی تھی۔

ہارون رشید ایک بار ابراہیم بن مہدی کے ہاں دعوت پر گیا، دسترخوان پر ایک برتن میں مچھلیوں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آئے، ہارون نے پوچھا کہ باورچی نے ٹکڑے اتنے چھوٹے کیوں کر دیئے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا: امیر المؤمنین! یہ مچھلیوں کی زبانیں ہیں، ہارون نے قیمت پوچھی تو وہ ہزاروں درہم سے متجاوز تھی، اس پر ہارون نے ہاتھ کھینچ لیا اور کچھ نہ کھایا۔

خلیفہ معتمد کے پاس ۹ ملین دینار تھے اس نے یہ آرزو کی تھی کہ ایک ملین اور مل جائیں تو کل دس ملین ہو جائیں اور پھر وہ ان سب کو یکجا کر کے کسی خاص جگہ نمائش کے لئے رکھ دے تاکہ دنیا میں یہ مشہور ہو جائے کہ معتمد کے پاس دس ملین دینار ایسے ہیں جن کی اسے چنداں ضرورت نہیں ہے، لیکن: ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آرزو پوری ہونے سے قبل پیغام اجل آپہنچا۔

اسراف و تعیش کے یہ اور اس جیسے سیکڑوں واقعات کتب تاریخ میں موجود ہیں، ہر دور میں اسراف و تصنع کی شکلیں بدلتی رہی ہیں، نئی تہذیب میں اس کی بے شمار جدید شکلیں سامنے آئی ہیں، اور زمانہ قدیم اور موجودہ دور میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اسراف و تعیش صرف طبقہ امراء کے بعض افراد تک محدود تھا، متوسط و ادنیٰ طبقے مکمل اس سے دور تھے، اور دوری کو بہتر سمجھتے تھے، لیکن دورِ حاضر میں اب یہ بواءِ اعلیٰ اور متوسط دونوں طبقوں میں سرایت کر چکی ہے، ایک شادی ہی کا مسئلہ ہے جس کی مہینوں پہلے سے تیاریاں ہوتی ہیں، پانی کی طرح پیسے بہائے جاتے ہیں، رقم خرچ کرنے کے مت نئے راستے نکالے جاتے ہیں، اور پورا خاندان اس اسراف کی وجہ سے ناقابلِ بیان بوجھ کے نیچے دبا رہتا ہے۔

اسی تصنع و تعیش نے پورے نظامِ زندگی کو پیچیدہ بنا ڈالا ہے، ماڈرن اور ایڈوانس اور اپ ٹو ڈیٹ کھلانے کے شوق اور ”اپر کلاس“ میں شامل ہونے کی حرص کچھ اتنی بڑھ چکی ہے اور ماڈیت کی چمک اس درجہ خیرہ کر چکی ہے کہ دل نہ چاہتے ہوئے تصنع اور دکھاوے کے لئے انسان اسراف و تعیش کی آخری حدوں تک جا پہنچنے کے لئے ہر طرح سے کوشاں ہے، اس صورتحال نے نہ جانے کتنے گھروں اور خاندانوں کا گھریلو اور خاندانی نظام خراب کر ڈالا ہے، کمالیات (غیر ضروری چیزوں) کی طرف تصنع کے طور پر مکمل توجہ عام ہو چکی ہے، گھر کی ضرور

یات پوری ہوں یا نہ ہوں مگر لباس بالکل اعلیٰ ہو، سامان آرائش اعلیٰ ہو، یہ سوچ کی تبدیلی فی الواقع عقلی نابالغی کی دین ہے، تصنع و تکلف کی یہی صورتحال ہر جگہ ہے، سرکاری ملازمت، تجارت، تقریبات، تعزیت و تہنیت ہر جگہ یہی تصنع اور دکھاوا ہے، کہیں بھی سادگی اور بے تکلفی نہیں ہے، اور اب تو ادب و لٹریچر میں بھی اس تصنع کا دور دورہ ہے، کوئی شعبہ اس سے محفوظ نہیں رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے فطرت سے بغاوت اور اس کی مخالفت ہے، فطرت سادگی پسند ہوتی ہے، وہ یہ چاہتی ہے کہ صاف، بے لاگ اور دو ٹوک گفتگو ہو، سوچ صاف ستھری ہو، ظاہر کی آرائش میں اعتدال ہو، ذہن و دماغ کبر اور بڑکپن کی سوچ سے دور رہیں، سادگی میں اصل لذت ہے، اس میں دلی راحت بھی ہے اور جسمانی صحت بھی، اسراف سے دوری بھی ہے اور اس بات کا مکمل شعور بھی کہ مادی زندگی ہی سب کچھ نہیں کہ اس کے پیچھے جی جان سے لگ جایا جائے، بلکہ روحانی خوبصورت زندگی بھی اس کی اولین مستحق ہے کہ اس پر توجہ دی جائے، اس کو وقت دیا جائے اور اس کو سنوارا اور سجایا جائے۔

ماڈیت و روحانیت کے مابین توازن کے اسی فقدان نے انسان کو بگاڑ کی آخری سرحد پر لے جا کر کھڑا کر دیا ہے، اور اس بگاڑ کو دور اسی طرح کیا جاسکتا ہے کہ یہ توازن پیدا کیا جائے اور روحانیت کو اولین درجہ دیا جائے اور ماڈیت کو بقدر ضرورت اختیار کرنے کا ذہن بنایا جائے، یہی مسئلہ کا حل بھی ہے اور بگاڑ سے نجات کا ذریعہ بھی۔



# ایک بڑا فتنہ

قیامت کی علامات اور قرب قیامت کے موقع پر پیش آنے والے فتنوں کے ذیل میں اس کا ذکر احادیث میں جگہ جگہ ملتا ہے کہ آخری دور میں علم پھیل جائے گا، ذرائع علم بہت ہو جائیں گے، علم پر فخر اور اکر کا سلسلہ بڑھ جائے گا مگر علم کی حقیقی روح و غایت عمل کم اور ختم ہوتی چلی جائے گی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ:

”قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ علم جہل اور جہل علم نہ

(مصنف ابن ابی شیبہ)

بن جائے۔“

اس روایت کا مصداق ہمارے اس دور میں پوری طرح سامنے آچکا ہے، صورتحال یہ ہے کہ اکثر افراد علم دین و شریعت سے بیزار اور دور ہیں، اور دینی علوم کے حصول و تحصیل سے گریزاں اور نفور ہیں، اور غیر دینی عصری علوم، کتب و مجلات، غیر مفید مضامین و امور کے مطالعہ و تحصیل میں منہمک ہیں، اسی طرح اصل مقصود علم سے جہالت ہے، اور غیر مفید و غیر مقصود سے واقفیت کی طلب ہے جسے حقیقی معنوں میں علم کے بجائے جہالت سے تعبیر کرنا چاہئے۔

حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ:

”ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں باتیں بہت ہوں گی لیکن قرآن سے

دوری ہوگی، قرآن پر گرد و غبار ہوگا، لوگ اس کو نہ دیکھیں گے۔“ (زوائد الزہد)

یہ حدیث حکماً مرفوع ہے، ایسی پیشین گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی کی

جاسکتی ہے۔ ہمارے موجودہ دور کی صورتحال یہی ہے کہ اخبارات، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے خبریں اور باتیں بہت بڑھ گئی ہیں، عصری کتابوں کی بھی یہی حالت ہے، اور ان کی طرف رجحان عام ہے، اور اس کے بالمقابل قرآن و سنت اور علوم دین سے اعراض، غفلت اور دوری کا سلسلہ جاری ہے، حدیث میں جس زمانہ کا ذکر ہے، قرآن بتا رہے ہیں کہ اس وقت ہم اسی زمانے میں ہیں۔

حضرت علیؑ نے ایک بار فرمایا:

”اے حاملین علم! علم پر عمل کرو، عالم وہی ہے جو علم کے مطابق عمل کرے، اس کا عمل اس کے علم کے موافق ہو، عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ علم حاصل کریں گے مگر علم ان کے گلوں سے آگے بڑھ کر دلوں میں نہ اتر پائے گا، ان کا عمل ان کے علم کے خلاف ہوگا، ان کا باطن ظاہر سے مختلف ہوگا، وہ حلقے لگا کر بیٹھیں گے اور ایک دوسرے پر فخر و تکبر کریں گے، اپنے ہم نشین کو دوسرے کے حلقہ میں بیٹھنے سے روکیں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں مستحق قبول نہ ہوں گے۔“ (داری)

حضرت کعب احبار فرماتے ہیں:

”وہ زمانہ آنے کو ہے کہ لوگ عمل نہ کرنے کے لئے علم حاصل کریں گے، عبادت نہ کرنے کی نیت سے تفقہ حاصل کرنا چاہیں گے، آخرت کے عمل سے دنیا کمانا چاہیں گے، ان کے دل ایلوے سے زیادہ تلخ ہوں گے (یعنی کج ہوں گے) اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زبردست فتنے میں مبتلا کیا جائے گا۔“ (داری)

ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس ماحول میں سب سے بہتر وہ شخص ہوگا جو قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہے گا، حضرت سفیان ثوری کے بارے میں آتا ہے کہ وہ خطیوں

اور گھٹیا لوگوں کو حدیث نہیں بتاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ علم عرب سے لیا گیا ہے جب ان نبطی اور رذیل افراد تک علم پہنچ جائے گا تو یہ علم کو بدل دیں گے۔ (الحلیۃ لابن نعیم)

ہمارے زمانے میں کتب کی بآسانی فراہمی وغیرہ ذرائع کے ذریعے علم عام ہو چکا ہے اور رذیل و بدنیت افراد اس میں من چاہی تبدیلی کر رہے ہیں اور اپنے باطل نظریات کی تائید کے لئے غلط استدلال و تاویل کر رہے ہیں۔

فرمان نبوت کے مطابق ہر آنے والا زمانہ سابقہ زمانے سے بدتر اور خطرناک ہوتا جائے گا، آج جو حالات ہیں کل اس سے بھی زیادہ ہولناک حالات سامنے آئیں گے، علمی میدان میں آئے دن انکشافات اور ترقیاں ہوتی جا رہی ہیں، سائنس دن بدن اپنا دائرہ بڑھاتی جا رہی ہے، زمین کے ہر گوشہ میں اور فضاؤں میں ریسرچ ہو رہی ہیں، خلائی تجربات ہو رہے ہیں، لیکن ان کا کوئی فائدہ عملی میدان میں ظاہر نہیں ہو رہا ہے، اخلاق و انسانیت کو دفن کیا جا رہا ہے، حقیقی مطلوب علم اور اس پر عمل سے غفلت ہے اور غیر مقصود امور کی طرف مکمل توجہ اور انہماک ہے۔

اور جن کے پاس علم دین ہے بھی ان میں اکثریت کے پیش نظر حصول دنیا ہے، رضائے الہی، آخرت کی نعمتوں سے سرفرازی اور اخلاص کا جذبہ نایاب ہو چکا ہے۔  
حضرت ابوسعید خدریؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ:

”ساٹھ سال کے بعد ایسے ناخلف جانشین آئیں گے جو نماز کو ضائع

کریں گے اور خواہش نفس کی پیروی کریں گے اور گمراہ ہو جائیں گے، پھر ایسے

جانشین آئیں گے جو قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے گلوں سے آگے ان کے

دلوں میں نہ اترے گا، قرآن پڑھنے والے تین طرح کے افراد ہوں گے، مؤمن،

منافق، فاجر و فاسق، مؤمن تو ایمان رکھے گا، منافق انکار کرے گا اور فاسق قرآن

(مسند احمد)

سے دنیا کمائے گا۔“

ایسے ماحول میں کامیاب وہی ہوگا جو مضبوطی سے دین پر عمل پیرا ہو، کتاب و سنت کو حرزِ جاں بنائے رہے، مستقل شیطانِ مردود سے اللہ کی پناہ کا طالب رہے، دنیا کی لذتوں کو مطلق اہمیت نہ دے، علم دین حاصل کرے اور اس پر صحیح عمل کرے، فتنوں میں نجات کا یہی راستہ ہے۔





# فوری طور پر ہمارے کرنے کے کام

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام اور اہل اسلام کے دینی و دنیوی استحکام، بقاء دوام اور قوت و شوکت کا اصل منبع اور سرچشمہ ایمانِ کامل، عملِ صالح، رسوخِ دینی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوتِ حق، اصلاحِ خلق کی سرگرمیاں ہیں، امت محمدیہ کا یہ خاص امتیاز اور مقصد حیات ہے، جسے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ  
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ.

(آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی مقصد کا ذکر مزید یوں ہوا ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ  
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

(آل عمران: ۱۰۴)

ترجمہ: تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

نیز فرمایا گیا کہ:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ.

(الاعراف: ۱۸۱)

ترجمہ: ہماری مخلوق میں ایک امت ایسی بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتی ہے عدل و انصاف سے کام لیتی ہے۔

امتِ مسلمہ جب تک اپنے اس مقصدِ حیات کو انجام دیتی رہی اور اپنے امتیاز پر قائم و دائم رہی اس کے وجود کی برکات و ثمرات سے عالم مستفید ہوتا رہا، لیکن پھر دینی غفلت اور بے حسی کے در آنے کی وجہ سے دعوتِ اسلام و نشرِ دین کا کام سست پڑ گیا، اسلام اور اس کی تعلیمات تو جوں کی توں باقی ہیں، وہ زندہ جاوید اور فنا آشنائیں، مگر اہل اسلام کی عملی و فکری قوتوں اور احساسات و جذبات میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، اب مسئلہ کا حل صرف عملی قوتوں کی بیداری میں منحصر ہے، اشاعتِ دین کی راہ اسی وقت ہموار ہوگی جب اس کے لئے اخلاص سے کام شروع کیا جائے گا۔

اور اس کام کی تاثیر مکمل طور سے اسی وقت سامنے آ سکے گی جب مساواتِ اسلامی کا تصور عام اور ذاتِ پات کا طبقاتی اختلاف ختم کر دیا جائے گا، طبقاتی اونچ نیچ کا تصور دعوتی راہ کا سب سے بڑا مانع ہے، ماضی میں غلبہ و اشاعتِ اسلام میں اسلام کے تصور مساوات کا بنیادی رول رہا ہے، دوسری چیز ہے اخوت و اتحاد، جب تک ہر کلمہ گو دوسرے کلمہ گو کے لئے اپنے دل میں محبت کے جذبات نہیں رکھے گا اور جب تک مسلم معاشرہ اخوت و اتحاد کا نمونہ نہیں بنے گا غیروں میں دعوتی کام مؤثر نہ ہو سکے گا۔

تیسری چیز ہے لوگوں کی دینی و اخلاقی اصلاح اور سدھار، کم سے کم مسلمانوں کی ظاہری زندگی اتنی پرکشش بنادی جائے کہ غیر مسلم اسلام سے وابستہ ہوں، نمازوں کا اہتمام، ارکان کی پابندی، شریک امور و رسوم، بدعات و خرافات، محرمات و منہیات، اخلاقی جرائم، خیانت و بدعہدی، جھوٹ وغیرہ سے مکمل دوری و بیزاری کی فضا عام ہوگی تو غیر مسلم اسلام کی طرف کشاں کشاں آئیں گے اور اسلام و حاملین اسلام کی عظمت ان کے دلوں میں جا گزیں ہوگی۔

اس سلسلہ میں دینی و شرعی مسائل و احکام کی تلقین و تعلیم اور دعوتی و تبلیغی امور میں شرکت کی دعوت و ترغیب بھی کافی مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے، جمعہ کے خطبات، خاص پروگراموں اور مجالس کے ذریعہ، مضامین و مقالات، کتابچوں، رسائل اور پمفلٹ کی مدد سے یہ کام ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف یہ پیش نظر رہے کہ ہماری جہالت اور غربت اور سادہ لوحی و کوتاہ اندیشی بھی ہمارے زوال و ضعف کے اہم اسباب ہیں، تعلیم کو عام کرنے، غربت کو دور کرنے کی کوشش میں لگنے، اور دور اندیشی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے، اس کے لئے مکاتب و مدارس کا قیام، درسگاہوں کا انتظام، مشنری اسکولس کا بائیکاٹ، تجارتی جہد پیہم وغیرہ کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔



# مال و اولاد کا فتنہ

انسان کو اللہ کی جانب سے مال، اولاد اور دوسری چیزوں کی شکل میں جو نعمتیں ملتی ہیں وہ سب آزمائش ہیں۔ قرآن اس حقیقت کو واضح کرتا ہے:

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا، قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ، بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. (الزمر: ۴۹)

ترجمہ: جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میرے علم کی بنیاد پر عطا کی گئی ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ نعمت (انسان کے شکر یا کفرانِ نعمت کی) آزمائش (ہوتی) ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ مزید ارشاد ہے:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ. (التغابن: ۱۵)

ترجمہ: تمہارے مال اور اولاد آزمائش ہیں۔

جو بسا اوقات انسان کی آخرت کو اپنی دنیا بنانے کے لئے داؤں پر لگا دیتے ہیں، ان سے مجبور ہو کر بسا اوقات آدمی حرام کام مرتکب ہو جاتا ہے، اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہ ہو جاتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، اسی درمیان حضرت حسن و حسین سرخ لباس پہنے ہوئے آگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو

اٹھا کر گود میں بٹھالیا پھر فرمایا کہ قرآن بالکل سچ کہتا ہے کہ اموال و اولاد آزمائش ہیں، دیکھو میں نے ان بچوں کو دیکھا تو مجھے صبر نہ آیا، میں نے خطبہ چھوڑ کر ان کو گود میں لے لیا، یہ بھی آزمائش ہے۔ (ترمذی شریف)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ کسی کو یہ دعا نہیں کرنی چاہئے کہ اے اللہ مجھے فتنہ سے بچائیے، کیونکہ اموال و اولاد اور دیگر نعمتیں بھی فتنہ ہیں، ان سے محرومی کی دعا نامناسب ہے، دعا میں یہ کہنا چاہئے کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مُّضِلّٰتِ الْفِتَنِ.

ترجمہ: اے اللہ میں فتنوں کے ذریعہ مبتلائے ضلالت ہونے سے پناہ

چاہتا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فتح مکہ کا ارادہ فرمایا اور اپنے قریبی صحابہ سے مشورہ کیا اور اس معاملہ کی رازداری کا حکم دیا، مگر مکے سے آئی ہوئی ایک مغنیہ خاتون کے ہاتھوں رؤساء قریش کے نام ایک مکتوب میں حضرت حاطب بن بلتعہؓ نے اس راز کو فاش کرنے کی کوشش کی، وحی الہی کی بنیاد پر اس خاتون کے مکہ پہنچنے سے قبل ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر مامور صحابہ نے وہ خط حاصل کر لیا اور راز فاش نہ ہوسکا، مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ نے حضرت حاطبؓ سے تحقیق چاہی، انہوں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے معاملے میں جلدی نہ کیجئے، میں نے اس راز کو فاش کرنے کی کوشش کفر و ارتداد کی وجہ سے نہیں کی ہے، نہ میں کفر کو پسند کرتا ہوں، الحمد للہ میرا ایمان مضبوط ہے، مجھے یقین تھا کہ یہ راز فاش ہو بھی جائے تب بھی فتح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گی، بس بات اتنی تھی کہ میرے بال بچے اور قرابت دار مکے میں ہیں، میں یہ راز فاش کر کے قریش پر احسان کرنا اور اس کے بدلے اپنے قرابت داروں کا تحفظ چاہتا تھا، بس یہی مقصد تھا، اس پر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر قبول کر لیا، اس واقعہ سے اولاد و اقارب کا فتنہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک بدری مشہور صحابی سے اولاد و اقارب کی محبت میں آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کرنے کی کوشش کا اقدام سرزد ہو گیا۔

قرآن میں مختلف مواقع پر یہ تاکید آئی ہے کہ مال و اولاد میں اتنا انہماک کی اللہ کی اطاعت اور ذکر سے غفلت ہو جائے ممنوع ہے۔ فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ، وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ. (المنافقون: ۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے مال و اولاد تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کریں، جو ایسا کرے گا (مال و اولاد کی محبت میں اللہ کے ذکر سے غافل ہوگا) ایسے ہی لوگ خسارے میں رہیں گے۔

مزید ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَرْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ. (التغابن: ۱۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہاری دشمن آخرت ہوتی ہیں تو ان سے محتاط رہا کرو۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شیطان انسان کے ایمان کی راہ میں بیٹھ کر اسے گمراہ کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ کیا اپنے آباء کا دین چھوڑ کر ایمان اختیار کر لو گے؟ مگر بندہ ایمان لے آتا ہے پھر ہجرت کا موقع آتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ کیا تم اپنے بال بچوں اور وطن کو چھوڑ دو گے؟ مگر بندہ ہجرت کر جاتا ہے، پھر جہاد کا موقع آتا ہے تو شیطان کہتا

ہے کہ کیا تم جان دے دو گے مگر بندہ جہاد پر جاتا ہے اور شہید ہوتا ہے، اللہ پر حق ہے کہ اللہ اسے جنت میں داخل کر لے گا۔  
(بخاری شریف)

قرآن وحدیث میں بے شمار نصوص ہیں جن میں اموال واولاد کے فتنے سے محتاط رہنے کی تلقین کی گئی ہے، عموماً گناہ اسی بے احتیاطی سے ہوتے ہیں، اس لئے بہت چوکنا وہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔



# اپنی دنیا آپ پیدا کر

موروثی، نسلی، خاندانی اور ماحولیاتی اثرات کے وجود کے تمام تر اعتراف و اقرار کے باوجود یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی کو خوشحال یا بد حال، مضری یا نافع و مفید، سعید یا شقی، خوش و خرم یا غمزہ و افسردہ بنانے پر کسی نہ کسی حد تک قادر ضرور ہوتا ہے۔

یہ بالکل بجا ہے کہ غباوت و ذکاوت، ذہانت و بلاغت، قوت و ضعف، شجاعت و بزدلی، خوش خلقی و بد خلقی میں انسان پر موروثی اور ماحولیاتی و خاندانی اثرات لازماً پڑتے ہیں، تاہم انسان کا عزم راسخ، ہمت مردانہ، حوصلہ مندی، اور پختہ تربیت موروثی و ماحولیاتی اثرات پر بڑی حد تک قابو یاب اور غالب ہو جاتے ہیں۔

انسان مثال کے طور پر اگر موروثی طور پر بیس فیصد ذہانت کا حامل ہے تو اپنے عمل و ارادہ سے وہ اپنی ذہانت کو بیس سے سو فیصد تو نہیں کر سکتا مگر اپنی بیس فیصد کی محدود ذہانت کو اپنی عزیمت و تربیت کے نتیجے میں اتنی اچھی طرح بر موقعہ و بر محل استعمال ضرور کر سکتا ہے کہ سو فیصدی ذہانت کے حامل کمزور ارادہ و عمل والے کے مقابلہ میں زیادہ فائدہ حاصل کر سکے اور پہونچا سکے، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیس پاؤں کا بلب اگر بالکل صاف ستھرا ہو تو اس کی روشنی سو پاؤں کے گندے بلب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، اور متوسط درجہ کا آدمی خوراک و پوشاک میں اعتدال و نظافت اور حفظانِ صحت کے اصول کی رعایت کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے اس آدمی سے فائق ہو جاتا ہے جو اعلیٰ خوراک و پوشاک تو استعمال کرتا ہو مگر اعتدال و نظافت اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی رعایت نہ کرتا ہو، اس طرح وراثت اور ماحول انسان کو زندگی کی



سعادتوں اور کامرانیوں سے نہیں روک پاتے اگر انسان ہمت، قوتِ ارادی اور قوتِ فکر و عمل سے مالا مال ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انسان کو کبھی مایوس اور قنوطیت کا شکار نہ ہونا چاہئے، اور ہمیشہ اپنے مستقبل کے بارے میں بہتری اور کامیابی کی توقع رکھنی چاہئے، اسے کبھی یہ خیال کر کے افسردہ نہ ہونا چاہئے کہ بہتری دوسرے کے حصہ میں مقدر کر دی گئی ہے اور کامیابی دوسرے کے نصیب میں لکھ دی گئی ہے، اور کامیابی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ اس کا عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ اللہ کی رحمت اس پر بھی سایہ فگن ہوگی، مستقبل میں وہ عنایتِ الہی سے ضرور بہرہ مند ہوگا، خدا کے ہاں دیر ضرور ہے اندھیر نہیں۔ قرآن کہتا ہے:

لَا تَيَاسُؤْا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ، اِنَّهٗ لَا يَبْئِـسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ  
الْكَافِرُوْنَ۔ (یوسف: ۸۷)

ترجمہ: اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

بس عزم کر کے بے راہ روی اور رحمتِ الہی کے نزول میں حائل گناہوں کو ترک کر دے، اللہ کی رحمت بلا تاخیر اس کی طرف متوجہ ہوگی، یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ ”اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو نبھانے والا کون ہو سکتا ہے؟“۔

اگر یہ خیال انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے کہ اس کا مستقبل بے حد تاریک ہے، روشنی کی کوئی کرن کبھی نمودار ہونے کی بالکل امید نہیں ہے، کوئی کامیابی کبھی اس کے دامن میں آنے کی نہیں ہے، تو یہ خیال زہر قاتل ہے جو انسان کو بے حد کمزور، پست حوصلہ، جامد اور مردہ بنا دیتا ہے، اس کے بالمقابل اگر انسان کامیابی و بھلائی کا امیدوار و منتظر ہو، حتیٰ المقدور کوشاں ہو، وسائل و اسباب کے استعمال کے لئے حسبِ امکان ہاتھ پاؤں مارتا ہو تو

پھر کامیابی کے دروازے دھیرے دھیرے اس کے لئے کھلتے جاتے ہیں، اس کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے اور اس میں قوت پیدا اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

جن لوگوں میں عام طور پر احساسِ برتری کبر کی حد تک پہنچا رہتا ہے، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ فطری بلندی اور کمال کے ساتھ متصف ہیں، وہ بلا محنت و مشقت اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتے ہیں، وہ طلسماتی کربت سے مٹی کو سونا بنا سکتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ وہ خوش خیالیاں ہیں جو حقیقت کی دنیا میں ریت کی دیوار سے بھی زیادہ ناپائیدار ثابت ہوتی ہیں، عملی زندگی میں جس نے بھی قدم رکھا ہے، پہلے مرحلہ میں اسے تردد و خوف، پریشانیوں، ناموافق حالات اور مشکلات کا سامنا بہر حال کرنا پڑا ہے، پھر جو بھی عملی میدان میں کامیاب ہوا ہے وہ اسی لئے کامیاب ہوا ہے کہ اس نے اپنے اندرون کی روشنی، عزیمت و بصیرت اور عزم و حرکت سے قوت کشید کی، اور جوں جوں قدم آگے بڑھاتا گیا راستے ہموار ہوتے گئے، منزل آسان ہوتی گئی، دشواریاں دور ہوتی گئیں اور خوف و شک ختم ہوتا گیا، اور جلد بازی کے بجائے وہ بتدریج منزل بہ منزل چلتا ہوا بالآخر کامیابی کے آخری مرحلہ تک اپنے اندر کے عزم و ہمت کی مدد سے پہنچ گیا، اب اگر پہلے ہی مرحلہ پر وہ ناامید ہو کر ہمت ہار جاتا تو وہ محروم رہ جاتا، مگر وہ مسلسل سعی و عمل میں لگا رہا اور بالآخر منزل مقصود تک پہنچ کر ہی دم لیا۔

ہر دور میں زندہ قوموں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ عمل اور مسلسل عمل پر کاربند ہوتی ہیں، مایوسی اور پست حوصلگی جیسے الفاظ سے ان کا لغت خالی ہوتا ہے، ہماری موجودہ ناکامی کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہم خود ساختہ اوہام و اعذار اور مشکلات اور رکاوٹوں میں گھرے ہوئے ہیں، ہم نے اپنے ذہنوں سے خود اوہام و مشکلات پیدا کر لئے ہیں جن کا خارجی وجود یا تو ہے ہی نہیں یا ہے تو برائے نام ہے، کسی بھی کام میں کبھی ہم بدگمانی میں مبتلا ہوتے ہیں، کبھی متوقع نتائج کے حصول میں شک ہم میں پیدا ہو جاتا ہے، کبھی ناکامی کا خوف دامن گیر ہوتا ہے، کبھی

اپنی سستی اور غفلت آڑے آجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کام میں اپنی کامیابی کو ناممکن سمجھ کر اپنے حوصلے پست کر دیتے ہیں اور ہمت ہار جاتے ہیں اور پھر محروم ہو جاتے ہیں۔

خود اعتمادی کا فقدان بہت بڑا مرض ہے، اسی نے ہم کو کمزور، مردہ دل، پست حوصلہ، جامد اور محروم بنا دیا ہے، اور اسی نے ہماری حرکت، استقامت اور بلند نظری و عالی فکری کا خون کر ڈالا ہے، ہم میں احساسِ کمتری جڑ پکڑ چکا ہے، اسی لئے سب ہم کو کہتر و ادنیٰ سمجھنے لگے ہیں۔

خود اعتمادی کا میابی کے لئے بنیادی شرط ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی حدیں کبر و غرور سے نہ ملنے پائیں کیونکہ کبر بھی پستی کا اہم سبب ہے، اس مرحلہ پر بڑی احتیاط، باریک بینی اور دور اندیشی کی ضرورت ہوتی ہے، خود اعتمادی کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی پر مکمل قدرت و استطاعت کا یقین آدمی میں پیدا ہو جائے اور وہ اپنی ذات اور اس کے تمام اچھے پہلوؤں سے بخوبی باخبر ہو جائے، جب کہ کبر و غرور کے معنی اپنے کو اصل استحقاق سے زیادہ کے قابل سمجھنا، بغیر عمل کے مطلوبہ نتائج کا مطالبہ کرنا، دوسروں کو پست اور خود کو بالا سمجھنا وغیرہ ہیں۔

خود اعتمادی کے جو ہر گراں مایہ سے آراستگی کے بعد انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مشکلات کا خوشی خوشی مقابلہ کرے، مصائب میں الجھ کر مضطرب اور پریشان ہونے کے بجائے مسکرائے اور:-

مصائب میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے

مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

کا مصداق بن جائے، مصائب کا خندہ روئی سے مقابلہ نجات کی راہیں کھول دیتا ہے، مصائب کے دور ہونے کا اہم سبب بنتا ہے، تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مصائب و حالات کا ہنستے مسکراتے مقابلہ کرنے والے کامیابی اور سعادتوں سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔

انسان پر اللہ کی یہ بہت بڑی نعمت ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تاریک (Negative) پہلوؤں کے بجائے روشن (Positive) پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز رکھے۔

روشن دماغی، عالی فکری، رجائیت، ناامیدی و مایوسی سے دوری، خود اعتمادی، بلند حوصلگی، کبر و غرور سے بچاؤ، احساس کہتری سے دوری، مصائب کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنا اور بخوشی جھیل جانا..... یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے ایک بے حد خوشگوار زندگی کی تشکیل کی جاسکتی ہے، اگر یہ عناصر کسی زندگی میں جمع ہو جائیں تو وہ ایک قابل رشک زندگی ہوگی۔

معاملہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے، چاہے تو محرومی کی زندگی گزارے اور چاہے تو ان عناصر پر اپنی زندگی کی عمارت استوار کر کے اسے قابلِ صدر رشک و فخر زندگی بنائے، بقول شاعر: ع

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے



# نعمتِ گویائی کا شکر مطلوب ہے

فلاسفہ کا خیال ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، اور اس کا امتیازی وصف نطق (گویائی) ہے، گویائی فی الواقع اللہ کی عجیب و غریب نعمت ہے، یوں تو اللہ کی قدرت ہر شے کو محیط ہے، وہ ہر چیز کو گویائی عطا کر سکتی ہے، اور قیامت میں محاسبہ کے ایک مرحلہ پر ایسا ہوگا بھی کہ انسان کی زبانیں گنگ اور منہ سر بہمر کر دیئے جائیں گے، اور ہاتھوں، پیروں، اعضاء بدن، اجزاء زمین سب گویا ہو جائیں گے اور انسان کے اعمال کے سلسلے میں حق کی شہادت دیں گے۔

لیکن اس دنیا میں اللہ نے صرف انسانوں کو یہ امتیاز بخشا ہے کہ ان کی زبانوں میں گویائی کی قوت رکھ دی ہے، اگر کوئی محروم گویائی گونگا شخص اپنے جذبات کا اظہار کر سکے تب جا کر ہمیں اس نعمت کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا، گویائی کی قدر ان سے جانی جاسکتی ہے، جو اس سے محروم ہوں، اللہ تعالیٰ اپنی ہر نعمت کی قدر دانی اور صحیح استعمال کا بندوں سے مطالبہ کرتا ہے، نعمتوں کی قدر اور جائز استعمال نہ کرنے والے ناشکری کے مرتکب ہوتے ہیں، اور وہ ہر لمحہ اپنے کو اللہ کے غضب کی طرف ڈھکیلتے چلے جاتے ہیں جس کا ایک مظہر بسا اوقات اُس نعمت سے محرومی کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے۔

قوتِ گویائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان پر آنے والے تمام الفاظ منہ سے نکال ہی دیئے جائیں؛ بلکہ ایک بندہ خدا کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ زبان سے نکلنے والے تمام الفاظ کو پہلے شریعت کی چھلنی میں چھان لیا کرے، روایاتِ حدیث میں آتا ہے کہ بہت

سے کلمے جنت میں داخلہ کا سبب بنتے ہیں اور بہت سے جہنم میں داخلہ کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ اچھی بات کو صدقہ قرار دیا گیا ہے اور جہنم سے آزادی کا سبب بتایا گیا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ میں زبان کے غلط استعمال سے بڑی سختی سے روکا گیا ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ:

الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ.

ترجمہ: مسلمان وہ ہے جس کی دست درازیوں اور زبان درازیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

زبان کے غلط استعمال میں غیبت، چغلی، حسد، گالی، مذاق وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔ گویائی کی نعمت کا ایک حق یہ بھی ہے کہ سنجیدگی اور وقار کا التزام کیا جائے، بات کرتے وقت اسلوب و انداز متانت اور دھیما پن لئے ہوئے ہو، بیجا شدت و سختی مخاطب کو بدگمان کرنے کے ساتھ ہی انسان کی اپنی سیرت کی تعمیر میں مضر ثابت ہوتی ہے۔

گفتگو کس انداز میں کی جائے؟ کون سے موقع پر کیا اسلوب اپنایا جائے؟ یہ ایک مستقل باضابطہ فن ہے، اپنی فطری ذکاوت، مخاطب کی نفسیات وغیرہ کی مدد سے انسان یہ فن باسانی سیکھ سکتا ہے، مخاطب کبھی تعظیمی انداز سے، کبھی عقلی گفتگو سے، کبھی جذباتی انداز سے، کبھی اختصار اور کبھی تفصیل سے متاثر ہوتا ہے اور اچھا متکلم ان سب کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے مقاصد میں با مراد ہو جاتا ہے۔

ایک بچہ اپنے باپ کے پاس آ کر بلا تمہید و سلام پیسے کا مطالبہ کرتا ہے، باپ کہتا ہے: میں نے تم کو کل پیسے دیئے تھے اب کیا روز آ نہ دوں؟ منع کر دیتا ہے، دوسرا بچہ آتا ہے، سلام کرتا ہے، ادب و تواضع کا مظاہرہ کرتا ہے، پھر کہتا ہے: ابا جان! آپ نے کل پیسے دیئے تھے، وہ خرچ ہو گئے، آج مزید ضرورت ہے، میں بار بار مانگتے ہوئے شرمندہ ہوں، اب آئندہ

احتیاط سے خرچ کروں گا، باپ اس بیٹے کی پیٹھ تھپھپھاتا ہے اور کہتا ہے: بیٹے شرمندگی کی کیا بات ہے؟ اور پھر مزید پیسے دے دیتا ہے۔

ایک بچہ کو نہ دے کر اور دوسرے کو دے کر باپ نے غلط نہیں کیا، بلکہ پہلے کو نہ دے کر اس کی بے ادبی اور غلط اندازِ گفتگو کی سزا دی اور دوسرے کو اس کے ادب و حسنِ انداز کا انعام دیا۔

عقل مند بیویاں جو اپنے خاوند کی مزاج شناس ہوتی ہیں وہ بھی اپنے مطالبات مناسب موقعوں پر مناسب انداز میں رکھتی اور منوالیتی ہیں جب کہ پھو ہڑ عورتیں موقعہ ناشناسی اور سخت کلامی کی وجہ سے محروم رہ جاتی ہیں۔

الفاظ کے زیر و بم، لہجات و انداز کا مخاطب کی طبیعت پر گہرا اثر پڑتا ہے، اسی طرح متکلم کے چہرہ کے نقوش اور زاویے بھی اس کی اندرونی حالت کی تصویر کشی کرتے ہیں، انسان کا چہرہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہوتا ہے جس سے اس کے اندرون کی کیفیات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے، خوش اخلاقی و بد اخلاقی، تواضع و تکبر، معصومیت و ڈھٹائی، شرم و بے شرمی، سنجیدگی و شوخی سب کا اندازہ ایک حساس آدمی کو چہرے کے نقوش اور زاویوں سے بیک لمحہ ہو جاتا ہے۔

بلکہ بات کا لہجہ اور چہرہ کے نقوش الفاظ کے معانی تک کو بدل ڈالتے ہیں، تعزیت کے موقعہ پر مسکرا کر ہنستے ہوئے ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ خوشی کے انداز میں تعزیتی الفاظ کہنا یا خوشی کے موقعہ پر اشکبار حالت میں، گلوگیر انداز میں غمناک چہرہ کے ساتھ مبارکبادی کے الفاظ کہنا دراصل تعزیت و تہنیت کے معانی کو بدلنا ہے، یہی حال ان کا بھی ہوتا ہے جو قرآن کی آیاتِ عذاب و انداز کو خوش کن آواز اور اسلوب میں اور آیاتِ ثواب و بشارت کو غمناک آواز و اسلوب میں پڑھتے ہیں۔

اندازِ گفتگو سے انسان کی شخصیت کا وزن بھی ہوتا ہے، خوبصورت بد زبان انسان ہرگز بد صورت خوش زبان پر فائق نہیں ہو سکتا، سنجیدہ و متین اسلوب آدمی کی سنجیدگی اور وقار کی علامت ہوتا ہے جب کہ غیر سنجیدہ سخت انداز آدمی کے پھکڑ پن اور ہلکے پن کا ثبوت ہوتا ہے۔ اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ انسان قوت گویائی کو اللہ کی نعمت سمجھ کر اسے صحیح مصرف میں صحیح انداز میں صرف کرے، اور اپنے طرزِ عمل سے کبھی اس نعمت کی ناشکری نہ کرے، نعمتیں اللہ نے آزمائش کے لئے دی ہیں۔

”اب جو شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو اللہ بے نیاز اور بزرگ و برتر ہے۔“ (النمل: ۴۰)





# دولتِ احساس و اخلاص

شہروں میں شاہراہوں پر ٹریفک سگنل اور ٹریفک پولیس کا انتظام و نظام ٹریفک کے نظام کو درست کرنے، بے ہنگم ہجوم کو کنٹرول کرنے اور سہولت پیدا کرنے کے لئے ہوتا ہے، ہر کسی کو اس نظام کی پابندی کرنی ہوتی ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں ہوتا، ٹریفک پولیس کے اشاروں کی تعمیل ہر راہ گزر کو لازماً کرنی ہوتی ہے ورنہ بصورتِ دیگر سزا ملتی ہے۔

لیکن داعی اور معلم کی زبان، حکم اور اشارے کی تعمیل اس طرح نہیں ہوتی جیسی ٹریفک پولیس کی، داعی خیر کی دعوت دیتا ہے، شر سے روکتا ہے، معلم اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے اور اخلاقِ بد سے منع کرتا ہے، مگر مدعو اور طلبہ پر داعی اور معلم کی باتوں کا برائے نام ہی اثر ہوتا ہے، داعی مال داروں کو فقراء پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، سست و کاہل کو حرکت و عمل پر ابھارتا ہے، اصحابِ اقتدار کو عدل کا پیغام سناتا ہے، اور اس کے لئے تحریری و تقریری ہر طرح کے وسائل اختیار کرتا ہے مگر اس کی دعوت عموماً بے اثر ثابت ہو جاتی ہے، اس کی دعوت کی تعمیل ٹریفک پولیس کے اشاروں کی تعمیل کی طرح نہیں ہوتی۔

والدین اولاد کو اچھی تربیت دینا چاہتے ہیں، محنت و کوشش کرتے ہیں، نرمی و سختی ہر طرح سمجھاتے ہیں مگر اولاد عام طور پر غلط راہوں پر چل پڑتی ہے اور والدین کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔

تھوڑا سا غور و فکر کیا جائے تو یہ فرق سمجھ میں آتا ہے کہ ٹریفک پولیس کے احکام کی تعمیل کا سبب دراصل اس کی اپنی شخصیت کی سحر انگیزی نہیں؛ بلکہ اس سزا اور پریشانیوں کا خطرہ ہے جو

ٹریفک نظام کی مخالفت کی صورت میں اسے لاحق ہوگا، یہ سزا قید، جرمانہ وغیرہ مختلف شکلوں میں ہوتی ہے جس سے بچنے کی خواہش انسان کو ٹریفک قانون کی مکمل رعایت کا پابند بنادیتی ہے۔

دوسری طرف داعی اور معلم کے احکام کی تعمیل نہ کئے جانے کا عام سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نقد دنیوی نقصان اور مادی خسارہ سامنے نہیں آتا، قرآنی بیان کے مطابق یہ حقیقت تو ناقابل انکار ہے کہ انسان پر مصائب و حوادث کا نزول ان کے اپنے برے کروت اور بے راہ رویوں کے نتیجہ میں ہوتا ہے، لیکن احساس اور حقیقت تک رسائی کی دولت اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت ہر کہ و مہ کو نہیں خاص لوگوں کو ہی عطا ہوتی ہے، اس لئے عام طور پر انسان اس پر غور نہیں کرتا کہ اس پر مصیبتیں کیوں آئیں، اسباب کی جستجو کے بعد اس کے ازالہ کی فکر کے بجائے وہ جزع فزع پر اتر آتا ہے، اپنی بے بصیرتی کی بنیاد پر وہ داعی و معلم کی دعوت خیر اور تعلیم خیر پر عمل نہیں کرتا اور اسے اپنی اس بے عملی میں کوئی ظاہری نقصان نظر نہیں آتا، نتیجہ وہ اپنی گناہوں میں ملوث زندگی میں مست و دیوانہ رہتا ہے اور خیر و حق کی طرف اپنی عنان توجہ نہیں موڑتا، حالانکہ اگر وہ دل پینا اور دیدہ عبرت نگاہ کا صحیح استعمال کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ خیر سے دوری، بے راہ روی، اور بد عملی انسان کو جہنم کے اس ہولناک و دردناک عذاب کی طرف کشاں کشاں لے جا رہی ہے جس کو دنیاوی سزاؤں اور مصائب سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے، اور جو چند روزہ نہیں؛ بلکہ دائمی اور ابدی ہے، اگر اس دائمی عذاب کا احساس آدمی کو ہو جائے تو وہ یک لخت ساری بد عملیوں سے گریزاں اور کنارہ کش ہو جائے، عذاب آخرت کے سوا دنیوی مصائب بھی چونکہ انسان کے اپنے عمل کے نتیجہ میں آتے ہیں، اس لئے اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آج دعوتی و تعلیمی سرگرمیوں کے بے اثر ہونے کی اصل وجہ ہماری بے حسی اور صحیح شعور سے محرومی ہے، دنیوی رونقوں میں بد مستی اور مادی دولتوں کی بے پناہ حرص نے خوفِ خدا، عذابِ آخرت وغیرہ کا احساس ہی سلب کر لیا ہے، احساس کا خاتمہ سب سے بڑی محرومی ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

احساس دوبارہ بیدار و زندہ کرنے کی صورت یہی ہے کہ گناہوں سے دامن کو الگ نہ دیا جائے، کسی مصلح و مربی کی تربیت میں کچھ وقت گزار جائے، کتاب و سنت کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔

دعوتی کاموں کے بے اثر ہونے کی ایک اور وجہ ہے اور وہ داعی کی ذاتی بے عملی اور دولتِ اخلاص سے محرومی ہے، دعوتی کام کرنے والے افراد اگر خود اپنی دعوت میں اخلاص و بے لوثی پیدا کر لیں، اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کی اصلاح کا مشن شروع کریں اور ان کی دعوت ان کے اندرون کی صدا اور ان کے دل کی آواز ہو تو اس کی تاثیر بالکل یقینی ہے، ماضی میں دعوتی کاموں کے مؤثر ہونے کا ایک اہم سبب داعی کا اپنا عمل و اخلاص تھا، چنانچہ اس سے زندگیاں بدلیں، معاشرہ کی کاپی لپٹی، انقلاب آیا اور دنیا نے دیکھ لیا، واقعہ یہی ہے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اخلاص سے محرومی کا نتیجہ آخرت میں کیا ہوگا؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ:

إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضَىٰ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ أُسْتُشْهِدَ، فَأَتَىٰ

بِهِ، فَعَرَفَهُ نِعْمَتَهُ، فَعَرَفَهَا، فَقَالَ فَمَا عَمِلْتُ فِيهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيكَ

حَتَّىٰ أُسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتُ وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ جَرِيٌّ، فَقَدْ

قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ حَتَّىٰ أُلْقِيَ فِي النَّارِ. (صحیح مسلم)

ترجمہ: قیامت کے روز سب سے پہلے جس کے خلاف فیصلہ سنایا جائے

گا وہ شخص ہوگا جو شہید ہوا ہوگا، وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا، تو اللہ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ ان کا اعتراف کرے گا، خدا پوچھے گا کہ نے تو ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ جواب دے گا کہ میں نے تیرے لئے جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہو گیا، اللہ فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ کہا، واقعہ یہ ہے کہ تو نے لوگوں میں اپنی بہادری کے چرچے کے لئے جنگ کی، دنیا میں تجھے تیری خواہش کے مطابق بہادر کہا جا چکا، پھر اللہ کے حکم کے مطابق اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا، اور ایک دوسرا عالم و معلم اور قرآن کا جاننے والا شخص اللہ کے حضور پیش ہوگا، اس سے بھی وہی سوال ہوگا، پھر اللہ کہے گا کہ تو نے اپنے علم و قرآن کی شہرت کے مقصد سے یہ کام کیا ہے، وہ مقصد پورا ہو چکا ہے، پھر اسے بھی منہ کے بل گھسیٹا اور داخلِ جہنم کر دیا جائے گا، یہی حالت سخاوت و فیاضی کی شہرت کی غرض سے مال خرچ کرنے والے دولت مند کی بھی ہوگی۔

ایک حدیث میں بے عمل و اعظ و عالم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ جہنم میں بدترین سزا میں مبتلا ہوں گے، شدتِ عذاب سے ان کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی۔

واقعہ یہی ہے کہ بڑے سے بڑا عمل اور کارنامہ اگر رضائے الہی کے جذبہ سے خالی ہو تو وہ اللہ کی نگاہ میں بالکل بے مایہ اور ہیچ ہوتا ہے، صحتِ نیت اور اخلاصِ اصل مطلوب ہے۔ دعوتی و تعلیمی اعمال کی تاثیر و تسخیر کے لئے داعی و معلم کا اخلاص، قوتِ عمل، بے لوثی اور صحتِ نیت کلیدی شرائط میں شامل ہیں، ساتھ ہی معاشرہ پر طاری بے حسی اور شعور سے محرومی بھی نیکیوں کی مدد سے دور ہو جائے اور چھٹ جائے تو صالح، ہمہ گیر اور زبردست انقلاب کے برپا ہونے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ انشاء اللہ۔



# انسانِ کامل

انسانِ کامل (Super Man) کی تحدید و تعین میں وصف نگاروں کی آراء میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، اہل مشرق عام طور پر انبیائے کرام کو کامل انسان سمجھتے ہیں، اس لئے کہ انبیاء اللہ کے وہ منتخب، برگزیدہ اور چیدہ و چنیدہ بندے ہوتے ہیں جو انسانوں اور اللہ کے درمیان رابطہ اور پیغامبری کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں، وہ اللہ کے بعد اس روئے زمین کے تمام انسانوں سے برتر ہوتے ہیں: ع

بعد از خدا بزرگ توئی ایں قصہ مختصر

صوفیائے کرام اور اصحابِ تزکیہ و احسان نے انسانِ کامل کا لفظ خوب استعمال کیا ہے، ابن العربی کی کتابوں میں اس کا ذکر جا بجا ملتا ہے، عبدالکریم جیلانی نے ”انسانِ کامل“ کے عنوان سے ایک باضابطہ کتاب بھی لکھی ہے، جس میں صوفیہ کا نقطہ نظر بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانِ کامل وہ ہے جو اللہ سے اتنا قریب ہو جائے کہ فنایت کے مقام تک پہنچ جائے، ماسوا اللہ کا خیال تک اس کے دل میں نہ آئے، اس مقام بلند پر انبیاء و اولیاء اور اللہ کے صالح بندے فائز ہوتے ہیں، اس مقام پر پہنچنے کے بعد انسانِ کامل ہو جاتا ہے، شریعت اس کا مزاج و طبیعت بن جاتی ہے، ایمان کی لذت اور چاشنی وہ محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے دل کی دنیا میں عجیب انقلاب آ جاتا ہے۔

اہل مغرب و یورپ کے ہاں مادہ پرستی اور شہوت پرستی کے افراط نے تمام قدریں ہی بدل ڈالیں، ان کا نقطہ نظر صوفیہ کے نقطہ نظر کے بالکل برعکس ہے، صوفیہ کی نگاہ میں روحانیت، خدا سے بے پایاں قرب، فنایت، مادہ پرستی سے گریز و فرار ہی کامل انسانیت کے مقام تک

پہونچانے کے اہم عناصر ہیں، جب کہ اہل یورپ کی نگاہ میں انسان کامل وہ ہے جو حد سے زیادہ مادہ پرست، شہوت پرست، ملحد و بے دین ہو، بعض مغربی مفکرین نے انسان کامل کا دار و مدار قوت پر رکھا ہے کہ جو شخص قوت، مردانگی، بہادری، اقدام و دلیری جیسے اوصاف کا حامل ہو وہی کامل انسان ہے، تو واضح، رحمدلی، منکسر المزاجی، اقدام سے گریز ناقص انسان کی علامتیں ہیں، کاملیت کے لئے قوت ارادہ اور سختی ضروری ہے، جب بھی کسی چیز کا ارادہ کر لیا جائے اسے کر کے ہی چھوڑا جائے، کسی پر رحم و ترس نہ کھایا جائے، اپنے ارادوں کی تنفیذ کے بعد اس پر ہرگز نام و پشیمان نہ ہوا جائے، گویا کامل انسانیت طاقت، سختی، تندرستی، جسمانی و مادی قوت، اور سنگ دلی میں منحصر ہے، اب جو نظام حیات نرمی، شفقت، مجتاجوں و پریشان حالوں پر مہربانی کی دعوت دیتا ہے وہ ناقص انسانیت کی دعوت دیتا ہے، اور مجبور و بیمار، غریب و محتاج، کمزور و ذلیل، اور نرم و متواضع انسان کامل انسانیت کی راہ میں حائل روڑے ہیں جنہیں ہٹا دینا چاہئے۔

ان کج فکر مفکرین نے اپنی اس تشریح کی روشنی میں قوم کو اس طرف بلایا ہے کہ پوری توجہ ایسے کامل انسان کی نشو و نما پر صرف کی جائے، اس کے لئے غرباء و محتاجین کو پس پشت ڈال دیا اور قربان کر دیا جائے، اصل مقصود مذکورہ بالا اوصاف کے حامل کامل انسانوں کی ایک کھیپ تیار کرنا ہے۔

گویا مساوات کی حقیقی روح، نرمی و مہربانی کے اعلیٰ اخلاقی اصول و اقدار، اور وحدت امت کے گراں مایہ جوہر سے اس ناقص فکر کا دامن بالکل خالی ہے، اور اس میں مادی و اقتصادی عارضی پہلوؤں کے سامنے اصل روحانی پہلو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

انسان کامل کی راست تصویر وہی ہے کہ اس کی زندگی کے مادی و روحانی دونوں پہلوؤں میں روحانی پہلو غالب ہو، مگر مادی پہلو بالکل نہ ہو یہ افراط ہے جو اعتدال سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا، واقعہ یہ ہے کہ مؤمن صادق اور انسان کامل ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، توحید خالص کا عقیدہ انسان کو بندہ انسان اور بندہ مال و زر بننے سے روکتا ہے، اس کی

روحانی قوت کے ذریعہ دوسروں سے اسے ممتاز کرتا ہے، اس کی وسعت و آفاقیت کے ذریعہ رنگ و نسل اور وطن کے امتیازات کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اسے مساواتِ حقیقی کا علمبردار بنادیتا ہے، مؤمن صادق کے پاس زندگی کا ایک پیام ہوتا ہے جس کے تحت وہ زندگی گزارتا ہے، زمانہ کتنا بدل کیوں نہ جائے، تصورات و اقدار کتنے تبدیل کیوں نہ ہو جائیں پر اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، وہ جوں کا توں اپنے نظام پر کاربند رہتا ہے۔

مؤمن صادق اپنے انسانی وجود کے لحاظ سے تو تمام انسانوں کی طرح ہوتا ہے، طبعی قانون کا وہ بھی سب ہی کی طرح تابع ہوتا ہے لیکن اس کا ایمانی وجود اسے روشن، نمایاں اور ممتاز کر دیتا ہے، یہی چیز اسے جاودانی عطا کر دیتی ہے، اس کے پاس زندہ جاوید پیام ہوتا ہے، اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت مستور ہوتی ہے، اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک زندہ جاوید مقصد کے لئے وقف رہتا ہے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلمان کہ ہے  
اُس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

اس کا نظریہ زندگی یہ نہیں ہوتا کہ خود کو ماحول و حالات کے تابع کر دیا جائے بلکہ زمانہ و ماحول اگر ناسازگار ہو تو اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا جائے، معاشرہ راہِ راست سے ہٹا ہوا ہو تو اس سے جنگ کی جائے، اور راہِ راست سے سرِ موخرا ف کو کبھی گوارا نہ کیا جائے، زندگی کی غلط و فاسد اقدار سے کبھی مصالحت و مفاہمت نہ کی جائے ان سے نبرد آزما ہوا جائے، اور بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح کی جائے۔

مؤمن صادق کی اندرونی و بیرونی دونوں زندگی ہر وقت و ہر آن عمل، حرکت، محبت، انسانیت اور اخلاقِ عالیہ سے لبریز رہتی ہے، وہ سراسر عمل ہوتا ہے، وہ کردار کا غازی ہوتا ہے۔ انبیائے کرام نے ہر دور میں ایسے ہی افراد پر مشتمل ایک صالح معاشرہ تیار کیا، اور

انبیاء کے بعد صحابہ و تابعین اور مجددین و مصلحین نے ہر دور میں یہی کام کیا ہے، اور آج بھی اس کی سخت ضرورت ہے۔

آج ہمارا ایک بہت بڑا المیہ ایسے کامل انسانوں اور سچے مسلمانوں سے محرومی ہے جو باضمیر اور سراپا عمل و حرکت ہوں، جو کبھی خریدے نہ جاسکتے ہوں، جنہیں کسی خوف سے دبایا نہ جاسکتا ہو، جو غلط قدروں سے کبھی سمجھوتہ (Compromise) کرنے پر آمادہ نہ ہو سکیں، اور جن کا وجود باطل کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج ثابت ہوتا رہے۔

دشمنانِ اسلام نے اپنی تخریبی منصوبہ بندیوں کے ذریعہ ہمہ نوعی اسباب و وسائل کی بے پناہ قوت سے اپنا ساز و راسی پر صرف کر دیا ہے کہ مسلمانوں میں ایسے کامل افراد دوبارہ ابھرنے نہ پائیں، مغربی نظام معاشرت اور نظام تعلیم کے ذریعہ، میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے اور اقتصادی قوتوں کا تمام تر استعمال کر کے دشمنوں نے مسلمانوں میں وہ مادی نقطہ نظر پیدا کرنے پر توجہ دی جو ان کو بلند اخلاقی اقدار اور خود اعتمادی سے محروم و تہی دست کر دے، ان کی خواہش یہ رہی کہ:-

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات

اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

دشمنوں کی ان کوششوں اور خواہشوں کو کافی کامیابی بھی میسر آئی ہے، تاہم تمام تر بگاڑ اور فساد کے باوجود، عمل اور پیہم عمل، اخلاص اور جاں فشانی سے ساری دشمنانہ سازشیں اور کاوشیں ناکام بنائی جاسکتی ہیں، شرط یہ ہے کہ ایمان صادق و راسخ کی روح سے معمور افراد اس کام کا بیڑا اٹھائیں اور پورے معاشرہ میں ایمان کامل کی لہر دوڑانے میں اپنی ہر ممکن کوشش صرف کر دیں، مخلصانہ کوششوں کی مقبولیت کی ضمانت قرآن وحدیث نے لی ہے، اور اس سے سچی ضمانت کوئی اور کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔





# موت سامانِ عبرت ہے

موت انسانی زندگی کا فطری نتیجہ ہے جس کا ظہور بالکل یقینی ہے بقول شاعر:۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے؟ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

مگر اس کے باوجود ہر شخص موت سے خوف زدہ رہتا ہے، اسے مصیبتِ عظمیٰ باور کرتا

ہے، جاہ و منصب، مال و دولت، عہدہ و اقتدار سب دھڑے کے دھڑے رہ جاتے ہیں اور

موت اپنے بے رحم پنچے گاڑ دیتی ہے، یہ اللہ کا قانون ہے جو کسی تبدیلی سے کبھی آشنا نہیں ہوتا،

موت کسی پر رحم نہیں کرتی، جوانوں کی مکمل جوانی، عظیم انسانوں کی عظمت و عبقریت، صحت

مندوں کی صحت و تندرستی، کوئی بھی چیز موت کی راہ میں حائل نہیں ہوتی بلکہ:

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ.

ترجمہ: ہر تنفس کو موت کا مزہ چکھنا ضرور ہے۔

زندگی ایک بے سہارا تنکے یا پانی کے بلبلے کی طرح ناپائیدار ہوتی ہے، متکبروں کا سارا

کبر و نخوت، مالداروں کا پندارِ دولت و ثروت، اصحابِ اقتدار کا غرور و تمکنت سب موت کے

سامنے ڈھے جاتے ہیں اور ذرّہ بے مقدار سے بھی زیادہ بے حیثیت ہو جاتے ہیں، سکندر

رومی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ مرا تو اس کی لاش کے پاس کچھ فلاسفر اکٹھا ہوئے

اور یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر کوئی اس حادثہٴ موت پر تبصرہ کرے اور مختصر جملہ بولے جس

میں خواص کے لئے سامانِ تعزیت اور عوام کے لئے سامانِ وعظ و نصیحت ہو، چنانچہ پہلے فلسفی

نے لاش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اے بولنے والے تجھے کس نے گونگا کر دیا؟ اے باعزت تجھے کس نے ذلیل کر دیا؟ اے شکاری تو خود جال میں کیسے پھنس کر شکار بن گیا اور کس نے تیرا شکار کر لیا؟ دوسرے نے کہا یہ تو انا تھا جو آج ناتواں اور بے بس ہو گیا، یہ باعزت تھا جو آج بے عزت ہو گیا، تیسرے نے کہا تمہاری تلواریں کبھی خون سے خشک نہ ہوتی تھیں، تمہارے انتقام اور سزا کا ہر دم خطرہ سب کو رہتا تھا، تمہارے مفتوحہ علاقوں کی طرف کسی کی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی ہمت نہ تھی، تمہارے عطیات بے پناہ تھے، تمہاری روشنی گل نہ ہوتی تھی مگر آج تمہاری روشنی بجھ چکی ہے، تمہارے انتقام و سزا کا کسی کو خطرہ نہیں، تمہارے عطیات کی توقع معدوم ہو چکی، تمہاری تلواریں بیکار ہیں اور تمہارے علاقوں پر دشمنوں کی نظر بد ہے، چوتھے نے کہا تم بادشاہوں کے بادشاہ تھے، آج تم بازاری اور عام لوگوں کے سامنے بے بس ہو، پانچواں بولا تمہاری آواز ہولناک و مرعوب کن تھی، تمہاری سلطنت غالب تھی، اب آواز بند ہے اور سلطنت ضائع ہو رہی ہے، چھٹے نے کہا تم سونے والے کا خواب تھے یا بدلی کا وقتی سایہ، ساتویں نے کہا کل تم سے کوئی مامون نہ تھا آج سب بے خوف ہیں، آٹھویں نے کہا، یہ وسیع و عریض دنیا دو ہاتھ کی قبر میں لپیٹ دی جائے گی۔

اس واقعہ کی تاریخی حیثیت و واقعیت گو مشکوک سہی تاہم اس میں بہت کچھ سامانِ عبرت و نصیحت ہے۔

قبیلہ بنو بویہہ کے معروف بادشاہ عضد الدولہ کے بارے میں آتا ہے کہ بیحد بارعب اور متکبر بادشاہ تھا، زمام حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے ملکی نظم و نسق فوراً درست کر دیا، فساد یوں کا قلع قمع کر دیا، جاسوس متعین کر دیئے اور لمحہ لمحہ کی خبر رکھی حتیٰ کہ میاں بیوی اور غلام و آقا تک ایک دوسرے سے ڈرنے لگے، بیحد بے رحم تھا، نہ جانے کتنے معصوموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، پھر وہ ایک باندی کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور پور پور اسی میں ڈوب گیا، اس کی

حکومت کا دائرہ بیحد وسیع تھا، اس کا رعب و دبدبہ سب پر طاری تھا، مگر پھر کیا ہوا؟ ۴۷ سال کی عمر میں اسے مہلک امراض نے آگھیرا، کوئی دوا کام نہ آسکی، اس نے خود اپنی حالت زار کا رونا شعری زبان میں رویا جس میں اس نے کہا کہ میں نے بڑوں بڑوں کو قتل کر ڈالا، کسی دشمن کو مہلت نہ دی، اپنا رعب بٹھایا، اب جب عیش کا وقت آیا تو ہلاکت و موت کا تیر مجھ پر آگرا، میرا جوش سرد ہو گیا اب میں بیکار و معطل کمرے میں پڑا ہوں، نہ میرا مال میرے کام آ رہا ہے اور نہ جاہ و اقتدار، سب چھن گیا اور کچھ نہ بچا، بالآخر اسی عالم میں وہ ختم ہو گیا، اس کی موت پر بھی فلسفیوں نے اسی طرح تبصرہ کیا جیسا سکندر کی موت پر کیا تھا، الفاظ کا فرق ضرور ہے مگر باتیں وہی ہیں۔

قارون کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

”یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی، ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا پھول نہ جاؤ اللہ پھولنے والے کو پسند نہیں کرتا تو اس نے کہا کہ یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے، آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔“ (سورۃ القصص)

موت اور عذاب الہی نے قارون کی طرح فرعون و ہامان، قوم نوح، عاد و ثمود اور پھر رؤساء قریش ابوجہل و ابولہب وغیرہ سب کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔  
واقعہ یہی ہے کہ:

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے  
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

اس لئے نہ کسی دولت مند کے لئے اپنی دولت پر ناز کا جواز ہے اور نہ کسی با اقتدار کے لئے اپنے اقتدار پر اتر اٹھ کا، موت ہر ایک کے لئے عبرت ہے، اور اسی کو حدیث میں ”هَازِمُ اللَّذَاتِ“ (تمام لذتیں ختم کرنے والی چیز) قرار دیا گیا ہے اور کثرت سے یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں دنیوی زندگی اور اس کی رونقوں کو ”مَتَاعُ الْغُرُورِ“ (دھوکے کا سامان) قرار دیا گیا اور اصل توجہ موت کے بعد کی زندگی پر مرکوز کرنے کی تاکید آئی ہے۔  
حضرت حسن بصریؒ کا یہ جملہ آب زر سے اور لوحِ قلب پر لکھنے کے قابل ہے کہ:  
مَا أَكْثَرَ الْمُعْتَبَرَ وَأَقَلَّ الْمُعْتَبِرَ.

ترجمہ: سامانِ عبرت بہت ہے مگر عبرت حاصل کرنے والے بہت کم۔  
اور یہی صورتِ حال سب سے خطرناک ہے۔



# نفس پرستی

مؤمن صادق کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ خیر پسند، شر سے نفور و گریزاں ہوتا ہے، اس کا دل تعلیمات نبوت پر مطمئن ہوتا ہے، جس شخص میں خیر پسندی، شر سے گریز اور ہدایات نبوت پر اطمینان کا جو ہر مفقود ہو تو اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ منافق ہے۔

دراصل خواہش نفس وہ بلا ہے جو انسان کو گمراہی اور ہلاکت کی راہوں پر لے جاتی ہے، قرآن کریم میں خواہش پرستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ، وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ، وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ، وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً، فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ، أَفَلَا تَذَكَّرُونَ. (الحجاثية: ۲۳)

ترجمہ: پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟

اس آیت میں کافروں کے چار اوصاف کا بیان ہوا ہے:

(۱) خواہش پرستی۔

(۲) دانستہ گمراہی و بے راہ روی۔

(۳) دلوں اور کانوں پر منجانب اللہ مہر کا لگ جانا۔

(۴) آنکھوں پر پردہ پڑ جانا۔

یہ چاروں اوصاف انسان کو گمراہ و بدراہ کر دیتے ہیں، خواہش پرست انسان پاکیزہ اور غلیظ میں فرق نہیں کرتا اور بدستور بربادی کی طرف چلتا ہی رہتا ہے۔ شریعت کے اساسی مقاصد و لوازم میں خواہش نفس، اور شیطان ملعون سے جنگ اور مقابلہ اور انہیں مغلوب و بے اثر کرنا ہے، توحید و وحدانیت کا مقصد کبر و غرور اور نخوت و تکبر کے عناصر سے جنگ ہوتا ہے، نماز کے مقاصد میں سستی و بیکاری سے، اور زکوٰۃ کے مقاصد میں زر پرستی اور بخل و حرص کے جذبات سے مقابلہ شامل ہے، روزہ کا مقصد کھانے پینے سے اور نفس کی سرکشی سے روکنا ہے، جہاد کا مقصد دنیا پرستی اور اپنی جان کی بیجا محبت کے عناصر پر بندش لگانا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خداوند قدوس کا منشأ یہ ہے کہ انسان روحانی اور اخلاقی کمال و جمال کا اعلیٰ ترین نمونہ بن جائے، اور خواہش نفس سے بالکل دور رہے، خواہش نفس ہی وہ بلا ہے جو اہل کفر و باطل کے حق سے منحرف ہونے اور راہِ راست سے بھٹکتے رہنے کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے:

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ، وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ.

(القصص: ۵۰)

ترجمہ: اگر وہ آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ سمجھ لیجئے کہ دراصل وہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے، اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔

ہوائے نفس ہی وہ شرعی قوت ہے جو انسان کو شر پر آمادہ کرتی ہے، وہی ہر جرم کا محرک، ہر گناہ کا باعث، ہر معصیت کا سبب اور ہر سرکشی کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے، انبیاء کی

تکذیب، رسولوں کی مخالفت، بتوں اور معبودانِ باطل کی پرستش، کتبِ سماویہ کی توہین و بے حرمتی، ہمہ وقت خنزریوں، سود خوری، شراب نوشی اور تمام جرائم کے پس پردہ یہی اتباعِ ہولی کا عنصر کارفرما ہوتا ہے، انبیاء و رسل کی راہِ دعوت میں یہ عنصر بار بار روڑا بنتا رہا ہے، قرآن میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ  
فَفَرِّقُوا كَذِبُتُمْ، وَفَرِّقًا تَقْتُلُونَ. (البقرة: ۸۷)

ترجمہ: پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔

قرآن کریم میں خواہش پرست انسان کو اس کتے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی ہمہ وقت لٹکتی زبان اور ٹپکتی رال کبھی سرد نہ پڑنے والی آتشِ حرص کی خبر دیتی ہے، دنیا پرست اور نفس پرست انسان جب ایمان کی رسی تڑا کر بھاگتا اور نفس کی اندھی خواہشوں کے قبضہ میں اپنی لگام اور باگ دیدیتا ہے تو وہ پھر کتے کی حالت کو پہونچے بغیر دم نہیں لیتا، وہ ہمہ تن شکم اور ہمہ تن شرمگاہ ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ.

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ تمام تربطی میلانات و قلبی رجحانات تعلیمات و ہدایاتِ نبوت کے زیرِ فرمان ہو جائیں تبھی ایمان کی روح، برکت، فیض، قوت اور نور حاصل ہو سکتا ہے، ہوائے نفس کو ہدائے نبوت کے تابع کیا جائے تبھی ایمان کا نور حاصل ہوتا ہے، حضرت علی کرم اللہ

وجہ نے فرمایا:

”مجھے تم پر بس دو چیزوں کا خطرہ ہے، ایک تو دور دراز کی امیدیں اور توقعات، دوسری خواہش پرستی۔

اللہ نے صاف حکم دیا کہ:

لَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ، إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ  
عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ. (ص: ۲۶)

ترجمہ: تم خواہشِ نفس کی پیروی مت کرو کہ وہ تم کو اللہ راہ سے بھٹکا دے  
گی، جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لئے سخت سزا ہے کہ وہ یوم  
الحساب کو بھول گئے۔





# معصوم بچوں کو ظلم سے بچائیے!

بازاروں، ہوٹلوں، چائے خانوں، کارخانوں اور منڈیوں میں ہر طرف کمسن بچوں کا جو ہجوم مزدوری کرتا ہے، بوجھ لادتا ہے، برتن صاف کرتا ہے، پر مشقت کام کرتا ہے، عام طور پر اپنے خاندانی حالات سے مجبور ہو کر اسے یہ اقدام کرنا پڑتا ہے، حقوق انسانی کے علمبردار اداروں کی نگاہ شاید ان معصوم بچوں کے مستقبل کی تعمیر اور تربیت و تعلیم کے لئے ان کی مالی کفالت کی ذمہ داری سنبھالنے پر نہیں پڑتی، ایک بڑا اہم سبب معصوم بچوں کی اس مشغولیت کا ہوٹلوں اور کارخانوں وغیرہ کے وہ مالکان بھی ہیں جو کمسن بچوں سے کم تنخواہ پر طاقت سے زیادہ کام لے کر استحصال و ظلم کرتے ہیں۔

ظلم و تشدد کا اثر ان کے مستقبل پر کیا پڑتا ہے اس کا حال کسی سے بھی مخفی نہیں ہے، اصحابِ ثروت کا طبقہ ہی درحقیقت ان معصوم بچوں کی تخریبی تربیت کا ضامن ہوتا ہے، ان بچوں کے ساتھ ان کے بے رحمانہ سلوک، نامنصفانہ رویہ، پر تشدد انداز ہی مستقبل میں ان بچوں کو مجرمانہ زندگی پر آمادہ کرتا ہے۔

عہد طفولیت صالح ذہنی تعمیر و تربیت کے لئے خشتِ اول کا کام کرتا ہے جو اگر کج رہ جائے تو پوری دیوار کج ہی رہتی ہے۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

علم النفس کے ماہرین نے اس اصول کو بہت اہم قرار دیا ہے کہ بچوں کی تربیت و تعلیم

و تلقین کے لئے تدریج سے کام لیا جائے، مناسب ماحول مہیا کیا جائے، ان سے مایوس نہ ہوا جائے، ترغیب و تشویق کے پہلو کو زیادہ اہمیت دی جائے اور سلبی پہلو اور تشدد سے آخری حد تک گریز کیا جائے، تشدد اور سلبی پہلو کا اثر بچوں کی نفسیاتی صحت، عقلی، لسانی، جذباتی اور جسمانی نشوونما پر بہت گہرا پڑتا ہے۔

اب اگر بچپن کے اس دور میں جو فارغ البالی اور صالح تربیت حاصل کرنے کا دور ہوتا ہے بچہ کو کام میں لگا دیا جائے، پر تشدد اور سلبی رویہ اختیار کیا جائے تو اس کے نفسیاتی دور رس و دیر پا اثرات آئندہ کی انفرادی و اجتماعی زندگیاں پر نمایاں ہوتے ہیں، اور اس وقت ان پر کنٹرول بے حد مشکل ثابت ہوتا ہے۔

ظلم و تشدد بچہ کے دل میں معاشرتی اقدار سے بغاوت کا تخم ڈال دیتا ہے، پھر وہ خیر کی راہ سے ہٹ کر شر کی راہوں کو چن لیتا ہے، سلبی رویہ اسے تخریبی کاموں میں مشغول کر دیتا ہے۔ ظالم و جابر باپ، سخت و تنگدل اور بے رحم استاذ، جفا شعار و ستم پیشہ مالک و ذمہ دار کے سلبی پر تشدد رویوں کے پس منظر میں اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو عہد طفولیت کے پر تشدد سلبی سلوک اور غلط کج تربیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

جو غلط فکر افراد آج کے بچوں کے ساتھ ظالمانہ، وحشیانہ اور نامنصفانہ سلوک روا رکھتے ہیں وہ شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی بچے کل بڑے ہو کر اس کا جواب اس سے زیادہ تشدد سے دیں گے، اور پھر وہ معاشرہ کا سکون غارت کریں گے، سلیقہ و تہذیب سے اپنی محرومی کا انتقام وہ معاشرہ کو اطمینان سے محروم کر کے لیں گے، انہیں ان کے اپنے حقوق سے محروم کیا گیا تھا اب وہ دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کریں گے، وہ ہر چیز پر حملہ آور ہوں گے، پھر نہ انہیں قانون روک سکے گا اور نہ مذہب اور نہ قید و بند، اس لئے کہ وہ قانون کے احترام سے نا آشنا، دین سے نابلد اور قید و بند چشیدہ ہیں۔

مستقبل کے مجرموں، دہشت گردوں کو آج کے محروم بچوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے، ان بچوں کی محرومی دور کرنے، ان پر سے ظلم کا ازالہ کرنے ہی سے جرم و دہشت گردی کا انسداد ممکن ہے۔

اصل جرم و ظلم و شر کا سرچشمہ اور بنیادی سبب وہ لوگ ہیں جو ان بچوں پر ظلم کرتے ہیں خواہ اپنی طاقت کے نشہ میں یا دولت کے نشہ میں، اس لحاظ سے آج کے مظلوم بے قصور بچوں کے آنسوؤں کو بے مایہ نہ سمجھا جانا چاہئے، ورنہ یہ آنسو رفتہ رفتہ سرکش و بے کنار طوفان کی شکل اختیار کر جائیں گے جن کے آگے بند باندھنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔



# نفس کے گناہ اور ان سے بچاؤ!

قرآن کریم میں واضح فرمایا گیا ہے کہ:

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي، إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ.

(یوسف: ۵۳)

ترجمہ: نفس بدی پر اکساتا ہے الا یہ کہ اللہ کی رحمت ہو، بیشک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

قرآن کی اس وضاحت سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر نفس کو لگام نہ دی جائے تو وہ برائی کی ظلمت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر رحمتِ الہی سے دور ہوتا جاتا ہے، انسان کے نفس میں جو وساوس اور برے خیالات آتے ہیں وہ اسکے ایمان اور تقویٰ کے لئے بیکار ضرور رہاں ثابت ہوتے ہیں، احکامِ الہی کی ہر مخالفت نفس کی اتباع کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، اسی کو قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ:

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ، وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ.

(النساء: ۷۹)

ترجمہ: اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے، اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسبِ عمل کی بدولت ہے۔

اہلِ نفاق ہر دور میں نفس پرست ہوتے ہیں، اور یہی نفس پرستی ان کو گمراہی کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے اور قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے، غزوہٴ احد کے موقع پر سخت

آزمائش کا موقع تھا، اس موقع پر اہل نفاق کا حال قرآن یوں بتاتا ہے کہ:

وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ  
الْجَاهِلِيَّةِ.

(آل عمران: ۱۵۴)

ترجمہ: ایک گروہ جس کے لئے (دین کے بجائے) ساری اہمیت بس  
اپنے نفس و ذات کی تھی، اللہ کے متعلق جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سرِ اسرِ خلافِ حق تھا۔  
نفس کے روگ بے شمار ہیں جن کا یہاں احاطہ نہیں ہو سکتا، چند نمایاں بیماریوں کا ذکر  
کیا جاتا ہے۔

## (۱) سستی اور بزدلی:

سستی غفلت پیدا کرتی ہے، ہمت و عزم کو مار ڈالتی ہے، اور انسان کو پست و ذلیل  
کر دیتی ہے، اپنے قولی و عملی فرائض کی ادائیگی سے سستی برتنے والا انسان بے عزت اور  
بدنام ہو جاتا ہے، یہ روگ جس کو لگ جاتا ہے اس کے ساتھ بدنامی کا بدنماداغ ضرور لگ جاتا  
ہے، یہی حال بزدلی کا ہے، حکماء کے بقول بزدلی ایمان کے منافی ہے، بزدل آدمی جہاد فی  
سبیل اللہ کی عظیم ترین عبادت سے محروم رہتا ہے۔

## (۲) کینہ اور بغض:

یہ بہت بڑے نفسانی روگ ہیں، یہ انا پرستی اور دوسروں سے لاتعلقی کی واضح علامت  
ہوتے ہیں، ایمان اسی وقت معتبر ہوتا ہے جب آدمی کا دل و نفس کینہ، کھوٹ اور کپٹ سے خالی  
ہو، اس کے بغیر حصولِ جنت ناممکن ہے۔

## (۳) حرص و طمع:

لاچ اور حرص انسان کا بہت بڑا عیب ہے، اس کا تعلق بھی نفس و قلب سے ہے، سچا

مؤمن اس روگ اور مرض سے دور رہتا ہے، حرص کو اہل کفر و نفاق کی علامت بتایا گیا ہے۔  
 نفس کو برائیوں سے بچانے اور بھلائیوں کی طرف راغب بنانے کے مختلف طریقے  
 ہیں، ان میں سے پہلا طریقہ صبر کا ہے، صبر نفس کو سنوارنے اور اس کو اخلاقِ عالیہ سے آراستہ  
 کرنے کا اہم ذریعہ ہے، دوسرا طریقہ مراقبہ کا ہے یعنی خفیہ و علانیہ بہر حال اللہ کی طرف  
 دھیان رہے، اس سے نفس پر قابو ملے گا، اور وہ گناہ کے لئے آزاد نہ رہے گا۔

ایک آدمی حضرت ابراہیم بن ادہم کے پاس آیا اور کہا کہ میں بہت گنہگار ہوں، کوئی  
 ایسا طریقہ بتا دیجئے کہ میرا نفس گناہ کی طرف مائل نہ ہو، ابراہیم بن ادہم نے فرمایا کہ اگر تم  
 پانچ کام کر لو تو کوئی گناہ تم کو نقصان نہیں پہنچائے گا:

(۱) جب تم گناہ کا ارادہ کرو تو اللہ کا رزق نہ کھاؤ، اس آدمی نے پوچھا کہ پوری  
 روئے زمین پر اللہ ہی کا رزق ہے تو میں کہاں سے کھاؤں؟ ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ مناسب  
 ہے کہ تم اللہ کا رزق کھاؤ اور پھر اسی کی نافرمانی کرو۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ جب تم گناہ کا ارادہ کرو تو اللہ کی زمین پر نہ رہو، اس آدمی  
 نے پوچھا کہ پوری زمین اللہ ہی کی ہے تو پھر میں کہاں رہوں؟ ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ  
 مناسب ہے کہ تم اللہ کا رزق کھاؤ اور اس کی زمین میں رہو اور پھر اس کی معصیت کرو۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اگر تم گناہ کا ارادہ کرو جب کہ تم اللہ کی زمین پر اللہ کا  
 رزق استعمال کر رہے ہو تو اتنا کرو کہ ایسی جگہ ڈھونڈ لو جہاں اللہ تم کو نہ دیکھ سکے، اس آدمی نے  
 کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ تو سب جگہ ہے اور سب کچھ جانتا ہے، ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ  
 مناسب ہے کہ تم اللہ کی زمین میں اس کا رزق استعمال کرتے ہوئے اس کی نافرمانی کرو جب  
 کہ وہ تم کو دیکھ بھی رہا ہو اور تمہارا گناہ اس کے علم میں بھی ہو۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ جب ملک الموت تمہاری روح قبض کرنے آئے تو اس

سے توبہ اور عمل صالح کی مہلت مانگ لو، اس آدمی نے کہا کہ وہ مہلت کب دے گا؟ ابراہیم نے فرمایا کہ جب تم جانتے ہو کہ موت کا وقت آنے پر نہ وہ ٹل سکتی ہے اور نہ تم کو مہلت مل سکتی ہے پھر کیسے مناسب ہے کہ تم گناہ کرو۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ جب قیامت میں ملائکہ جہنم تمہیں جہنم کی طرف لے جائیں تو تم ان کے ساتھ نہ جانا، اس آدمی نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہاں تو میں مجبور ہوں گا، ابراہیم نے کہا کہ پھر تم گناہ کے ساتھ نجات کیسے پاسکتے ہو، اس پر اس آدمی نے کہا کہ اتنا میرے لئے بس ہے، میں سب گناہوں سے دامن کش ہوتا ہوں۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ گناہوں سے بچاؤ کے لئے مقام صبر اور مقام مراقبہ کے حصول کی کتنی اہمیت ہے۔



# اجتماعیت کی روح

اسلام کا مزاج اور پیغام یہ ہے کہ وہ اجتماعیت، اتحاد اور اجتماعی ربط و جوڑ کو انتشار، تعصب، اور باہمی توڑ کے مقابلے میں پسند کرتا ہے، وہ انفرادی فکر کے مقابلے میں اجتماعی فکر پیدا کرنا چاہتا ہے، اس میں ذاتی مقاصد کی تکمیل کے بجائے اجتماعی مقاصد کی تکمیل کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

جاہلیت اور اسلام کا ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ جاہلیت میں قبیلہ بندی کا رواج تھا، ہر بجا و بیجا اور جائز و ناجائز میں اپنے خاندان کی تائید اور مدد ضروری امر سمجھا جاتا تھا، مگر اسلام نے قبیلہ بندی کا رجحان ختم کر کے حق پسندی اور عدل کی تعلیم دی، ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا، اور ہر طرح کے ظلم اور نا انصافی کو بہت بڑا جرم قرار دیا، مظلوم کی مدد یہ بتائی کہ اسے بچایا جائے اور ظالم کی مدد یہ بتائی کہ اسے ظلم سے روکا جائے۔

تعصب کو اسلام بہت بڑا گناہ بتاتا ہے، ارشادِ نبوی ہے:

مَنْ دَعَا إِلَىٰ عَصَبِيَّةٍ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ قَاتَلَ عَلَىٰ عَصَبِيَّةٍ فَلَيْسَ

مِنَّا، وَمَنْ مَاتَ عَلَىٰ عَصَبِيَّةٍ فَلَيْسَ مِنَّا۔ (ابوداؤد شریف)

ترجمہ: جو تعصب کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو تعصب

سے لڑے وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو تعصب پر مَرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ تعصب کی

حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: ”تعصب ظلم پر اپنے بھائی کی مدد کا نام ہے۔“ (ابوداؤد)



فرمایا گیا کہ اجتماعیت رحمت ہے اور انتشار عذاب ہے، اجتماعیت میں برکت ہے اور انتشار میں بے برکتی ہے، جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے، انتشار میں شیطان کی مسرت اور معیت ہوتی ہے، جنت کا حصول اجتماعیت پر موقوف ہے، اسی لئے اسلام میں اجتماعیت کی بے حد اہمیت آئی ہے اور ہر فرد بشر میں اجتماعی روح پیدا کرنے کی مکمل کوشش کی گئی ہے، اور اجتماعی تقاضوں کو انفرادی تقاضوں سے مقدم رکھنے کی بجد تاکید کی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ، يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا. (متفق علیہ)

ترجمہ: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے عمارت کی طرح ہوتا ہے، جس طرح عمارت کا ایک حصہ دوسرے حصے کی مضبوطی کا ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی قوت اور سہارا ثابت ہوتا ہے۔

اسلامی تعلیمات و احکام کا تجزیہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اجتماعی روح پھونکنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور انفرادی تقاضوں کو پس پشت ڈالنے کی تاکید کی گئی ہے، نماز کے باب میں جماعت کی تاکید، اہمیت، ترک جماعت پر سخت وعیدیں، اذان کا اہتمام، مساجد کی اہمیت و تقدس، عیدین کا نظام سب کچھ اس کا واضح ثبوت ہے، ایک نابینا صحابی کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا نماز پڑھنے اور جماعت میں شریک نہ ہونے کی اجازت نہ دی، اور یہ ارادہ فرمایا کہ جماعت میں بلا عذر نہ آنے والوں کو گھروں کے ساتھ جلادیں، نماز باجماعت کی صفیں لگی ہوں اور کوئی پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا ہو اگرچہ جماعت میں شریک ہو اس کو بھی ناپسند فرمایا کہ یہ اجتماعی نظام کے خلاف ہے، حضرت وابصہ بن معبدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کو نماز دہرانے کا حکم دیدیا۔

(ترمذی شریف)

شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی آدمی مسجد میں آئے اور صفیں پُر پائے، اور پیچھے تنہا

کھڑے ہونے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہو تو آگے سے نرمی سے کسی نمازی کو پیچھے اپنے ساتھ کر کے اس کے ساتھ نماز پڑھے، اور جسے پیچھے کیا جائے وہ ضرورت سمجھ کر خوش اسلوبی سے پیچھے آجائے، اس عمل کو باعثِ اجر بتایا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ظاہری و باطنی ہر اعتبار سے وحدت و اجتماعیت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔

مسلمان نماز میں سورہ فاتحہ پڑھتا ہے اور اپنے مالک سے یہ دعا کرتا ہے کہ:

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ.

ترجمہ: ہم کو سیدھا راستہ دکھا دیجئے۔

یہاں بھی اجتماعی دعا ہے، وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے اللہ سے ہدایت کی دعا مانگتا ہے، رمضان میں مسلمان تنہا نہیں سب کے ساتھ مل کر روزہ رکھتا ہے، عید کے دن تنہا نہیں سب کے ساتھ مل کر روزہ توڑتا ہے، اگر اس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا ہے اور کسی نے نہیں دیکھا، اور اگلے دن سب بے روزہ ہیں تو اسے بھی بے روزہ رہنا ہے، اگر اس نے تنہا عید کا چاند دیکھا ہے اور کسی نے نہیں دیکھا، اور اگلے دن سب روزے سے ہیں تو اسے بھی روزے سے رہنا ہے، کسی بھی طرح جماعت سے الگ نہیں ہونا ہے، اسی کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

”روزہ اسی دن ہوگا جب سب لوگ روزہ رکھیں، اور عید اسی دن ہوگی

جب سب لوگ عید منائیں۔“ (ابوداؤد شریف)

ان مسائل فقہیہ میں ائمہ کے جزوی اختلافات تو ہیں مگر اس حقیقت کا ادراک بہر صورت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اپنی ہر تعلیم اور ہر حکم کے ذریعہ اپنے متبعین میں اجتماعیت کی روح پیدا کرنا اور انفرادیت کی فکر ختم کرنا چاہتا ہے، واقعہ بھی یہی ہے کہ ہر مرحلہ زندگی میں ملت کا مفاد اجتماعیت ہی سے وابستہ ہے۔



# اجتماعیت

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے جو تعلق اور رشتہ ہوتا ہے وہ فی الواقع اخوت، مودت، وفاداری اور اخلاص کی ناقابل شکست بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، ایمان کامل اس تعلق کی مضبوطی، استحکام اور جماؤ میں سب سے زیادہ مؤثر عنصر ثابت ہوتا ہے، ایک مسلمان جب یہ حقیقت اپنے دل میں بٹھالیتا ہے کہ تمام مسلمان رنگ و نسل، حسب و نسب، زبان و کلچر، اور وطن و مکان کی حدود و قیود سے بلند ہو کر ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور ایک ہی نظام سے مربوط ہیں تو پھر وہ اپنے تمام اعمال و معاملات اور برتاؤ میں اس حدیث کو بنیاد بناتا ہے کہ ”جو اپنے لئے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرو اور جو اپنے لئے ناپسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے ناپسند کرو“ اور وہ ہر آن قرآنی اور نبوی ہدایات کو پیش نظر رکھتا ہے، چنانچہ وہ ہر جائز موقع پر اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا، اچھا گمان رکھتا ہے، بدگمانی، غیبت، تجسس اور حسد و چغلی وغیرہ سے حتی الامکان بچتا ہے۔

خداوند قدوس نے اہل ایمان کو جابجا اس کا حکم دیا ہے کہ وہ انسانی حقوق پامال کرنے کا جرم ہرگز نہ کریں، اور نہ ہی انسانی کرامت اور آبرو پر حملہ کریں، یہ بھی واضح فرمایا گیا ہے کہ اہل ایمان کے باہمی تعلقات کو سب سے بڑا خطرہ غیبت سے ہوتا ہے، غیبت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے بھائی کے واقعی عیب کو اس کی عدم موجودگی میں اس طرح بیان کیا جائے کہ اگر وہ سن لے تو ناگواری کا اظہار کرے، اور اگر وہ عیب اس میں نہ ہو پھر بھی اس کی طرف منسوب کر دیا جائے تو یہ بہتان ہے۔

ایک حدیث میں وارد ہوتا ہے کہ:

”ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا غیبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ“ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سننے تو اسے ناگوار ہو۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگرچہ میری بات حق ہو؟ آپ نے جواب دیا اگر تیری بات باطل ہو تب تو یہ بہتان ہے۔“ (موطا امام مالک)

احادیث میں بہت صاف فرما دیا گیا ہے کہ:

”بدترین بہتان کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے۔“ (ابوداؤد)

قرآن کریم کی سورہ حجرات میں اہل ایمان کو ان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں فساد برپا کرنے والی برائیوں سے بچنے کی بڑے بلیغ اسلوب میں تاکید فرمائی گئی ہے، ان میں تمسخر اور استہزاء، طعنہ زنی، برے القاب سے پکارنے، بدگمانی، پوشیدہ عیب کا سراغ لگانے اور غیبت کا نام بہ نام ذکر کر کے ان کی شاعت ظاہر کی گئی ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بڑی خصوصیت سے فرمائی تھی کہ مسلمان کا خون مال اور آبرو تینوں محترم ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی کسی نوع کا حملہ ناروا ہے۔

اجتماعی زندگی کے لئے حسد اور بغض بھی ستم قاتل ثابت ہوتے ہیں، ایک حدیث میں فرمایا گیا:

”تمہاری طرف بھی پہلی قوموں کا مرض چپکے سے چل پڑا ہے، اور وہ حسد

اور بغض ہے، یہ دین کو مونڈ دینے والی چیزیں ہیں۔“ (مسند احمد)

بلکہ اہل ایمان کو ان امور کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو باہمی تعلقات کو خوشگوار بنائیں اور اجتماعیت کی روح پیدا کریں، چنانچہ خوش گمانی، اپنے بھائی کی پردہ داری،

دفاع، جان و مال و آبرو کا تحفظ، جائز امور میں ہر ممکن مدد اور تعاون، حقوق کی پاسداری اور ادائیگی وغیرہ کا حکم فرمایا گیا ہے۔

اتحاد و اتفاق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور قوت کا واحد حل ہے اور یہ حل تمام امتوں اور مذاہب میں متفق علیہ رہا ہے، وحدت و اتحاد کے لئے مرکز صرف اسلام و قرآن بن سکتا ہے اور باہمی اتحاد اطاعت الہی پر موقوف ہے، معاصی کے ساتھ یہ انعام نہیں ملتا۔ اس اصول کو حرزِ جاں بنائے رکھنا چاہئے۔



# نیکوئوں کا زہر؛ حسد

کسی بندہ خدا کو حاصل شدہ دینی، علمی، عملی، مالی، بدنی و جسمانی، اخلاقی و روحانی نعمتوں کے زوال اور خاتمہ کی تمنا کا نام شریعت کی اصطلاح میں حسد ہے۔

حسد بدترین اخلاقی مرض ہے، انسانی زندگی کی فتنہ ترین خصلت ہے، اسی لئے قرآن وحدیث کے نصوص میں اس کی بے پناہ مذمت اور اس سے دور رہنے کی تلقین وتاکید آئی ہے، عہد رسالت میں اللہ عزوجل نے اہل ایمان کو قرآن و ایمان کی جو بے بہا دولت و نعمت عطا فرمائی تھی بد باطن یہودی اس سے جلتے تھے اور ان کے دلوں میں ہمہ وقت یہی تمنا اور آرزو مچلتی رہتی تھی کہ یہ نعمت مسلمانوں سے سلب کر لی جائے۔ قرآن کی صراحت ہے کہ:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا،

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ. (البقرة: ۱۰۹)

ترجمہ: اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں

ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹالے جائیں، اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا

ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔

حسد کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ یہ ہے کہ صرف صاحب نعمت سے سلب نعمت

کی تمنا دل میں ہو، خواہ خود اس تمنا کرنے والے کو وہ نعمت میسر آئے یا نہ آئے، حسد کی سب

سے بدترین صورت یہی ہے، اہل نفاق اسی حسد میں مبتلا تھے کہ وہ اہل ایمان سے نعمت ایمان

سلب کئے جانے کے متمنی تھے اور انہیں اپنی طرح کا فرد یکھنا چاہتے تھے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کو حاصل شدہ نعمت کے بارے میں یہ تمنا کرے کہ یہ نعمت مجھے مل جائے، لیکن چونکہ یہ نعمت اسے دوسرے سے سلب کئے جائے بغیر مل نہیں سکتی ہے اس لئے ضمناً اس کی یہ آرزو بھی ہوتی ہے کہ صاحب نعمت سے یہ نعمت سلب کر لی جائے، یہ صورت بھی قابل مذمت ہے، ہاں اگر صاحب نعمت سے سلب نعمت کی تمنا نہ ہو بلکہ اس جیسی نعمت خود حاصل ہونے کی آرزو ہو تو یہ بالکل معیوب نہیں ہے بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے۔

حسد کے اسباب و محرکات کا تجزیہ واضح کرتا ہے کہ اس میں مختلف امور کا فرما ہوتے ہیں، سب سے بنیادی سبب بغض و عداوت ہے، اکثر دوسرے سے جذبہ عداوت ہی حسد کی راہ ہموار کرتا ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ بغض و عداوت کی وجہ سے پیدا ہونے والا حسد عام ہوتا ہے، اس میں مساوات کی قید نہیں بلکہ ایک ادنیٰ شخص اعلیٰ سے اعلیٰ شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے، تعلیمی میدانوں میں تجربات رکھنے والے افراد کے سامنے بغض و عداوت کے نتیجے میں پیدا شدہ حسد کے نمونے اور مظاہر جا بجا آتے ہیں، کچھ نہ جاننے والے افراد عموماً ہمہ دانی کے مدعی اور جہل مرکب میں مبتلا ہو کر واقعتاً علمی صلاحیتوں سے مالا مال قابل رشک و فخر اور لائق احترام و قدر افراد سے حسد کرنے لگتے ہیں اور ان کی علمی ترقی میں حائل ہونے لگتے ہیں۔

حسد کا ایک سبب جاہ پرستی ہے، یہود کو اہل اسلام سے اس بنیاد پر بھی حسد تھا کہ وہ اہل اسلام کو اپنے اقتدار کی راہ کا روڑا سمجھ رہے تھے، آج بھی مختلف شعبہ حیات میں اس کے نمونے ملتے ہیں، حسد کے دیگر اسباب کبر، تعلیٰ، ذاتی فخر کا خیالی تصور، خبث باطن، بد طبیعت وغیرہ آتے ہیں۔

کسی عالم سے پوچھا گیا کہ فلاں صاحب آپ سے ناراض رہتے ہیں اور آپ کی مذمت کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ میرے سگے رشتہ دار ہیں، پڑوسی بھی ہیں اور ہم پیشہ بھی ہیں، یعنی قرابت، ہمسائیگی اور ہم پیشگی یہ سب اسباب حسد بن جاتے ہیں۔

فقیر ابو الیث سمرقندی کا مقولہ ہے:

”حسد کے اثرات محسود (جس سے حسد کیا جائے) تک پہنچنے سے پہلے ہی حاسد کو پانچ سزائیں مل جاتی ہیں، ایک تو دائمی غم و فکر، دوسرے بے فیض مصیبت، تیسرے عیب و مذمت، چوتھے اللہ کی ناراضگی اور پانچویں اللہ کی جانب سے بے توفیقی۔“

اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسد سے اجتناب کی بہت سخت اسلوب میں تاکید فرمائی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

اتَّقُوا الْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ

الْحَطَبَ. (سنن ابوداؤد شریف)

ترجمہ: تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ:

”ہر شخص کو خوش کرنا ممکن ہے، لیکن حاسد کو خوش نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس کی خوشی تو نعمت کے زوال ہی سے ہوتی ہے۔“

حسد ایسا گناہ ہے جو متعدد گناہوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، حاسد نفاق پیشہ ہوتا ہے، اسے قطع رحمی کرنی پڑتی ہے، وہ بہتان طرازی اور افترا پردازی کرتا ہے، وہ دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھنے کا مجرم ہوتا ہے، وہ دنیا کی محبت میں جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے، وہ دروغ گوئی، غیبت، افشائے راز، پردہ دری، استہزاء، تجسس اور ایذاء مسلم جیسے قطعی حرام امور کا مرتکب ہوتا ہے۔

محسود (جس سے حسد کیا جائے) کے لئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ وہ حاسد کے شر سے پناہ مانگتا رہے، اللہ کی طرف رجوع ہو، گناہوں سے تائب ہو، اللہ پر کلی اعتماد و توکل کرے، حاسد کی بدگوئیوں پر صابر رہے اور حسب موقع اس کو سمجھائے۔



حسد کو شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ وہ حسد سے دور رہے، اخلاص کے ساتھ توبہ کرے، اپنے سے کمتر کو دیکھ کر شکر کرے، دعا کرتا رہے، سلام کا اہتمام کرے، قرآن غور سے پڑھے اور راہِ خدا میں صدقہ دے، اپنے پاس موجود چیز پر قانع رہے۔ حدیث میں آیا ہے:

”جب تمہیں مالی و علمی اعتبار سے اپنا برتر نظر آئے تو اپنے سے کمتر کو دیکھو“۔ (بخاری شریف)

اور ایک حدیث میں حسد سے نجات کا یہ طریقہ بیان ہوا ہے کہ:

”جب حسد ہو جائے تو حسد پر عمل نہ کرو اور حد سے نہ گزرو“۔

حسد اخوتِ اسلامی کے شیرازے کو منتشر کر دیتا ہے اسی لئے اس سے پوری طرح بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے نہ بچنے والوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔



# نوجوانوں میں صحیح شعور پیدا کرنے کی ضرورت

کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ نوجوان کسی بھی قوم کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، قوموں کا مستقبل ان سے وابستہ ہوتا ہے، انقلابات ان کے دم سے آتے ہیں، علمی سرگرمیاں بیشتر ان ہی کی ہوتی ہیں، اسلام چونکہ آفاقی اور عالمی مذہب ہے، اس لئے وہ نوجوانوں کو خاص اہمیت دیتا ہے، ایک حدیث میں جوانی کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

اِغْتِمِ خُمْسًا قَبْلَ خُمْسٍ، حَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَشَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ مَرَضِكَ.

(مشكاة المصابيح)

ترجمہ: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، زندگی کو موت سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے، مالداری کو محتاجی سے پہلے، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اور صحت کو بیماری سے پہلے۔

دوسری حدیث میں فرمایا گیا کہ:

”قیامت کے روز ہر فرد زند آدم سے کچھ سوالات ضرور ہوں گے، عمر و زندگی کے بارے میں سوال ہوگا کہ کس کام میں گزاری اور صرف کی؟ جوانی کے قیمتی لمحات کیسے گزارے؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ علم کے مطابق عمل کیا یا نہیں؟“۔

اسلام تمام انسانوں خصوصاً نوجوانوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ وہ ایمانی رسوخ پیدا کریں، کفر و فسق اور عصیان و طغیان سے گریزاں ہوں، طاعات کی طرف راغب ہوں، بلکہ اسلام کہتا ہے کہ طاعات الہیہ میں منہمک نوجوان قیامت کے روز عرش الہی کے سائے میں ہوگا جہاں اس کے سوا کوئی اور سایہ میسر نہ آئے گا۔

تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ اصلاح و صلاح کی تمام تر تحریکات، کوششوں اور سرگرمیوں میں نوجوانوں کا رول سب سے اہم اور نمایاں رہتا ہے، سیدنا ابراہیم خلیل اللہ نے نوجوانی ہی میں اپنی قوم کے برے عقائد، بت پرستی، اصنام تراشی، گمراہی اور بدکرداری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور بتوں کو پاش پاش کرنے کے بعد قوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ حقیقت واضح کی تھی کہ:

أَفْتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ، أَفِ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ، أَفَلَا تَعْقِلُونَ. (الانبیاء: ۶۶)

ترجمہ: یہ وہ بت ہیں جن میں نہ نفع پہنچانے کی صلاحیت ہے اور نہ ضرر رسانی کی، تم پر تفت ہو اور تمہارے ان ہاتھوں سے تراشے ہوئے بے جان معبودوں پر تفت ہو، تم عقل سے محروم ہو۔

حق گوئی کی سزا ان کو آگ کے الاؤ میں ڈال کر دی گئی، مگر ان کے صبر و استقامت میں ذرا بھی کمی نہ آئی اور پھر اللہ کے حکم سے وہ مشتعل آگ ان کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی۔

سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا کہ ان کو وہ ذبح کر رہے ہیں، یہ خدا کا حکم تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام نوجوان تھے، مگر ان کے دل میں اطاعت الہی کا جذبہ موجزن تھا، انہوں نے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اباجان:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ.

(الصافات: ۱۰۲)

ترجمہ: آپ حکم الہی کی تعمیل کیجئے، آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔

اطاعت و قربانی کی یہ مثال تاریخ عالم کی منفرد مثال ہے۔

حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہما السلام پر سب سے پہلے ایمان لائے، اس وقت وہ نوجوان تھے، پھر نبی بھی بنائے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو عین عفتوان شباب میں مختلف مصائب و محن سے گزرنا پڑا، قید و بند کی صعوبتوں سے سابقہ پیش آیا، مگر ان کا صبر و ثبات بے نظیر تھا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی نعمتوں سے دنیا میں بھی سرفراز فرمایا، ملک کے خزانے ان کے سپرد کر دیئے گئے۔ سورہ کہف میں جن اہل حق کے ثبات ایمانی اور رسوخ دینی کا ذکر ہے وہ قرآن کے بقول:

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى، وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ  
إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، لَنْ نَدْعُو مِنْ دُونِهِ  
إِلَهًا.

(الکہف: ۱۳-۱۴)

ترجمہ: چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخش دی تھی، ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پوری جوانی صبر و عزمیت کے کارناموں سے لبریز ہے،

ہجرت کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے باہر دشمنوں کا قافلہ موجود تھا کہ آپ کے نکلتے ہی نعوذ باللہ کام تمام کر دیا جائے، مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ تم میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ، میں تمہارے لئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان، میں ہمہ تن آمادہ ہوں، پھر حضرت علیؑ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سوئے اور چند دنوں بعد قبائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آملے، قرآن کریم کی اس آیت کے اولین مصداق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ، وَاللَّهُ رَؤُفٌ

(البقرة: ۲۰۷)

بِالْعِبَادِ.

ترجمہ: کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رضائے الہی کی طلب میں اپنی جان

کھپا دیتے ہیں، ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔

کوہ صفا پر چڑھ کر تو حید و رسالت کی تصدیق کی جو دعوت اور پیغام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مکہ والوں کو دیا تھا اور اس کا رد عمل انکار، لعن طعن اور بدگوئی کی شکل میں سامنے آیا تھا، پورے مجمع میں صرف حضرت علیؑ تھے جنہوں نے اس پیغام کو بے چون و چرا قبول کر لیا تھا اور پھر یہی ان کے رگ و پے میں پیوست اور ان کے جسم کے ریشے ریشے میں سما گیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت پر اولین توجہ فرمائی تھی، وہ ان میں اخلاص، اسلامیت، استقامت دینی کے ساتھ شجاعت، خطر پسندی اور عقیدہ حق کی راہ میں ہر قربانی بے دریغ پیش کرنے کا جذبہ بے تاب پیدا کرنے کی لئے ہمہ وقت کوشاں رہا کرتے تھے، نوجوان صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اے لڑکے! اللہ کو یاد کرو، اللہ تم کو محفوظ رکھے گا، اللہ کی احکام کی پابندی کرو وہ ہمہ وقت تمہاری مدد کرے گا، جب بھی مدد مانگنا ہو اللہ سے مانگو، اللہ کے سوا کوئی لاکھ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے نہیں پہنچا سکتا۔“

قرن اول کے نوجوانوں کا فیض ہے کہ اسلام مشرق سے مغرب تک پھیلا، اس کی اذان گونجی، اس کا علم لہرایا اور لوگ دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو کام میں لگایا، ان کو عسکری قیادت سونپی، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وہ نوجوان صحابہ کرام تھے جن کی قربانیوں سے اسلامی فتوحات وجود میں آئیں، حق کا پرچم بلند ہوا اور اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

فاتح سندھ محمد بن قاسم ثقفی نے سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کیا اور اپنے حسن اخلاق سے دل بھی جیت لئے، ایسے نمونے تاریخ اسلام میں بے شمار ہیں۔

ہمارے موجودہ دور کا بہت بڑا المیہ نوجوانانِ ملت کی بے راہ روی اور صحیح شعور سے محرومی ہے، وہ اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر اور غافل ہیں، انہیں جو کردار ادا کرنا ہے اور جو کام انجام دینا ہے اس سے ناواقف ہیں، موجودہ حالات میں امت کو جو خطرات لاحق ہیں اور اغیار کی طرف سے جو منظم حملے ہو رہے ہیں ان کا اصل مقابلہ نوجوان ہی کر سکتے ہیں، ان کو بیدار ہونا پڑے گا، ان ہی کی جرأت و عزیمت سے مشکل مرحلے سر ہو سکیں گے اور الجھی گتھیاں سلجھ سکیں گی۔



# اخلاقی قوت ہی اصل جوہر ہے

ایک عرب شاعر نے بہت پتے کی بات کہی ہے کہ:

وَأِنَّمَا الْأُمُّ الْأَخْلَاقُ مَا بَقِيَتْ  
فَإِنْ هُمْ ذَهَبَتْ أَخْلَافُهُمْ ذَهَبُوا

امتیں اور اقوام اخلاق کی بدولت زندہ رہتی ہیں، اخلاق نہ رہیں تو امتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

امتوں کی حیات و بقاء کے لیے اخلاق کی اہمیت کلیدی نوع کی ہوتی ہے، اخلاق کی دولت سے محرومی زندگی کو بے روح و بے کیف بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند قدوس نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے اپنے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا تو انہیں خود اخلاق کا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا اور ان کی تعلیمات میں اصلاح اخلاق کو بنیادی درجہ عطا کیا، قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا:

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ. (القلم: ۴)

ترجمہ: بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ ترین درجہ پر ہیں۔

یوں تو دنیا کے تمام مذاہب کی اساس اخلاق ہی پر ہے، تمام انبیاء و مصلحین نے اخلاق کی تعلیم دی، لیکن اسلام میں اخلاق کو بجد اہمیت دی گئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد حسن اخلاق کی تکمیل بتایا ہے، خود قرآن کریم میں آپ کا ایک اہم مقصد بعثت تزکیہ (اصلاح اخلاق و تعمیر سیرت) قرار دیا گیا ہے، تمام مذاہب میں اسلام کو یہ

امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو اتنی اخلاقی تعلیمات دے دی ہیں جو ان کو راہِ راست سے بھٹکنے سے روک دیں، یہی وجہ ہے کہ ان اخلاقی تعلیمات نے اصلاح کا وہ کام کیا ہے جو قوانین بھی نہ کر سکے۔

اسلام اس شعبے میں طبع انسانی کے ان نازک و باریک مسائل پر توجہ دیتا ہے جو اپنی نزاکت و لطافت کے باوجود حیات انسانی پر دیرپا اثر ڈالتے ہیں، فی الواقع انسان کی ظاہری زندگی کے اعمال اس کے باطنی اخلاق ہی کا پرتو ہیں، اسی لیے اسلام نے ان کی اصلاح کو ہدف بنایا تاکہ باطن کے سدھار کے بعد ظاہر بھی درست ہو سکے، چنانچہ قرآن نے اعلان کر دیا کہ:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا. (الشمس: ۹-۱۰)

ترجمہ: جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور سنوارا وہ فلاح یاب ہو گیا اور جس

نے اسے (گناہوں میں) دبا دیا وہ ناکام ہو گیا۔

اسلام نے جو عبادات فرض کی ہیں ان کا بھی ایک اہم مقصد اصلاح اخلاق ہے، نماز کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہ برائیوں و بے حیائیوں سے روکتی ہے، روزہ کا مقصد تقویٰ و شکر کی کیفیت پیدا کرنا بتایا گیا ہے، زکوٰۃ کے ذریعہ انسانیت کی ہمدردی و مدد کا سبق دیا جاتا ہے، اس لحاظ سے ہر عبادت کا اساسی مقصد اخلاق کی پاکیزگی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے بعد اخلاقِ حسنہ کو سب سے زیادہ مقدم قرار دیا ہے، قرآن میں انہیں اہل ایمان کو فلاح یاب قرار دیا گیا ہے جو اپنے ایمان کے بعد اخلاق کی اصلاح کر لیں، مثلاً نماز میں خشوع، لغویت سے اجتناب، آبرو کی حفاظت، بے حیائی سے دوری، وعدہ و معاہدہ کی پاس داری، امانتوں کی ادا نیگی وغیرہ کی پابندی کریں، قرآن میں جا بجا اہل ایمان کے اوصاف میں اخلاقِ حسنہ کا ذکر آیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا کتب حدیث میں آتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ:



”خدا یا! مجھے بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہترین اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا۔“

احادیث میں بارہا حسن اخلاق کی اہمیت کا ذکر کیا گیا ہے، کہیں اسے کمال ایمان بتایا گیا ہے کہیں اسے قیام لیل اور دن کے روزوں کے مساوی قرار دیا گیا ہے اور کہیں اسے قیامت کے دن میزانِ عمل کی سب سے وزنی اور بھاری چیز کہا گیا ہے، کہیں اسے خدا اور رسول کی محبت و قرب کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ کے اخلاق اختیار کرو، اس طرح اخلاقِ حسنہ کی تلقین کی گئی ہے، دراصل اخلاقِ حسنہ صفاتِ خداوندی کا پرتو اور مظہر ہیں اور اخلاقِ حسنہ ایمان کی تکمیل اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ مظاہر ہیں، اقبال نے بھی یہی واضح کیا ہے کہ ایک مومن مختلف و متضاد اخلاق و صفات کا حامل ہوتا ہے جو دراصل اللہ کی صفات و احوال کے مظاہر ہوتے ہیں مثلاً کشادہ قلبی، حلم و درگزر میں وہ اللہ کی صفتِ غفار کا پرتو ہے، اور دین کے سلسلہ میں شدت اور باطل پر غضب میں وہ اللہ کی صفتِ قہار کا پرتو ہے اور پاکیزگی میں صفتِ قدوس کا مظہر ہے وغیرہ:۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

حسنِ اخلاق کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ وہ دلوں کو فتح کرتا ہے اور طوفانوں کے رخ موڑ دیتا ہے، تاریخ اس محیر العقول تاثیر کے نمونوں سے پر ہے، فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین مکہ کے ساتھ حسن اخلاق اور عفو و درگزر کا معاملہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے اور کایا پلٹ گئی۔

اخلاق کی طاقت نے ہر دور میں بے شمار معرکے سر کئے ہیں، لاتعداد موقعوں پر سر بلند

کیا ہے، دعوتِ اسلامی کا کارواں ہر دور میں اسی طاقت کے ذریعہ تیز رفتار رہا ہے، قوموں کے عروج و زوال کے پس منظر میں اخلاقی بلندی و پستی کا اہم رول ہوتا ہے، اخلاقی بے راہ روی اور گراؤٹ زوال وادبار کی پیغامبر ہوتی ہے اور اخلاقی پاکیزگی، رفعت، ترقی و عروج کی ضامن۔ امتِ اسلامیہ تاریخ کے ہر دور میں اخلاقی قوت سے مالا مال رہی ہے، اس وقت بھی یہ قوت موجود ہے اگرچہ مختلف النوع موانع اس قوت کے لیے سدّ راہ بنے ہوئے ہیں، تاہم تاریکی کی اوٹ سے روشنی جھلکتی نظر آتی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ان موانع کا مقابلہ کیا جائے اور ہر قیمت پر اخلاقی قوت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اس لئے کہ اخلاقی قوت سے محروم قومیں تمام تر عسکری و دیگر قوتوں سے لیس ہونے کے باوجود بالآخر ناکام ہوتی ہیں، اسلام نے ہر شعبہ زندگی میں اخلاقی خوبی کو اپنانے کا حکم دیا ہے اور اسی پر عمل کر کے اس دور کا مسلمان اپنی مشکلات سے نجات پاسکتا ہے اور تمام حالات کا مقابلہ کرسکتا ہے، اگرچہ وہ بے خیل و سپاہ ہے لیکن وہ حکمرانوں سے بھی زیادہ عالی ظرف اور بادشاہوں سے بھی زیادہ بلند نگاہ ہے، اور اگر وہ مطلوبہ اوصاف و اخلاق کو اپنالے اور اسے اس کا مقام دیدیا جائے تو وہ انقلاب برپا کرسکتا ہے اور اس کا جمالِ جہاں افروز، جلالِ عالم سوز کی صورت میں جلوہ گر ہو سکتا ہے، بقول اقبال مرحوم:

مسلمان گرچہ بے خیل و سپاہے است  
 ضمیر او ضمیر بادشاہے است  
 اگر او را مقامش باز بخشند  
 جمال او جلالِ بے پناہے است



# اعلیٰ انسانی کردار

صاحب ایمان بندوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ناموافق سے ناموافق حالات میں انتہائی جذباتی صورتِ حال میں بھی دین اور کتاب و سنت کا حوالہ آنے پر بالکل خاموش ہو کر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، پھر انہیں اپنے مادی، دنیاوی منافع اور نقصانات کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام اس خصوصیت میں انتہائی نمایاں مقام رکھتے تھے، ان کے اوصاف میں ”وَقَافِينَ عِنْدَ كِتَابِ اللَّهِ“ (قرآن کا حوالہ آتے ہی بالکل رک اور ٹھہر جانے والے) کا وصف بہت اجاگر ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا واقعہ ہے کہ عیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے برادر زادے الحز بن قیس کے گھر پر مقیم ہوئے، الحز بن قیس ان افراد میں تھے جنہیں حضرت عمرؓ اہمیت دیتے تھے، وہ ان کے مقرب مشیر تھے، عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا: تم کو امیر المؤمنین سے قربت حاصل ہے، میری اُن سے ملاقات کرادو، حضرت حرؓ نے امیر المؤمنین سے اپنے چچا کے لئے وقت چاہا، ملاقات ہوئی، عیینہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو بڑی بے ادبی سے بولے: اے خطاب کے بیٹے! خدا کی قسم! تم ہمیں نہ تو کچھ مال دیتے ہو اور نہ ہمارے بیچ انصاف کرتے ہو، حضرت عمرؓ کو یہ بات سن کر غصہ آ گیا، حضرت حرؓ نے فوراً عرض کیا: اے امیر المؤمنین! اللہ نے قرآن میں اپنے نبی کو حکم دیا ہے:

حُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ. (الاعراف: ۱۹۹)

ترجمہ: درگزر کیجئے اور نیکی کا حکم دیجئے، اور جاہلوں سے اعراض کیجئے۔

اے امیر المؤمنین! یہ آدمی جاہلوں میں سے ہے، اس سے اعراض کیجئے اور نظر انداز

کردیتجئے، راوی کا بیان ہے کہ قرآن کی آیت سنتے ہی حضرت عمر بالکل رک گئے۔

وَاللّٰهِ مَا جَاوَزَهَا عُمَرُ حِينَ تَلَاهَا عَلَيْهِ، وَكَانَ وَقَافًا عِنْدَ

كِتَابِ اللّٰهِ. (صحیح بخاری: کتاب التفسیر)

ترجمہ: بخدا قرآن کی یہ آیت جوں ہی پڑھی گئی حضرت عمر تھم گئے اور ذرا بھی تجاوز نہیں کیا، قرآن کا نام آتے ہی وہ بالکل رک جایا کرتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثہ وفات کا صدمہ اس قدر دل دوز تھا کہ بہت سے صحابہ فرطِ تحیر و تعجب سے بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھے، حضرت عمر پر یہ کیفیت بہت بڑھی ہوئی تھی، روایات میں آتا ہے کہ وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ”بہت سے منافق یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کی وفات ہوگئی، خدا کی قسم آپ کی وفات نہیں ہوئی ہے؛ بلکہ آپ اپنے رب کے پاس گئے، جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے، چالیس دن تک قوم کے پاس نہ تھے، پھر لوٹ آئے تھے، خدا کی قسم! آپ بھی اسی طرح لوٹ آئیں گے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام لوٹ آئے تھے، صورتِ حال بے حد نازک تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ملی تو تشریف لائے، مسجد نبوی کے دروازے پر اترے، کسی سے کچھ بولے بغیر سیدھے آپ کے حجرے میں گئے، آپ کے رخِ انور سے چادر ہٹائی، اُسے بوسہ دیا اور رونے لگے، پھر فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ نے جو موت آپ کے لئے مقدر فرمادی تھی وہ آچکی، اب کوئی اور موت نہیں آنے والی ہے، اُس کے بعد باہر آئے، حضرت عمر فرطِ صدمات سے بولے جارہے تھے، انہیں چپ کرانا چاہا، مگر وہ چپ نہ ہوئے، صحابہ حضرت ابوبکر صدیق کی طرف متوجہ ہوئے، حضرت ابوبکر نے خطاب شروع کر دیا، اور فرمایا:

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ

مِنْكُمْ يُعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ، قَالَ اللَّهُ: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا

رَسُولٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى

أَعْقَابِكُمْ، وَمَنْ يُّنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا، وَسَيَجْزِي  
اللَّهُ الشَّاكِرِينَ. آل عمران: ۱۴۴ ﴿۱۴۴﴾

ترجمہ: تم میں سے جو شخص محمدؐ کی پوجا کرتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ کی موت واقع ہو چکی ہے، اور تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو یقیناً اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اُسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں، اب اگر ان کی موت واقع ہو جائے یا وہ قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے، جو شخص اُلٹے پاؤں پلٹ جائے وہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اور اللہ شکر کرنے والوں کو بدلہ دے گا۔

صحابہ جواب تک غم و حزن کے افراط سے حیرت میں تھے، حضرت ابو بکر کا یہ خطاب سن کر انہیں یہ یقین آ ہی گیا کہ آپ واقعی وفات پا چکے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ آیت پڑھی تو ایسا لگا جیسے لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ قرآن میں یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے، اب ان سے سن کر سب کی زبان پر یہی آیت آ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے ابو بکر کو یہ آیت پڑھتے سنا تو دہشت کی وجہ سے زمین پر گر پڑا، میرے پاؤں اپنا بوجھ نہ اٹھا سکے، اور مجھے یقین آ گیا کہ آپ کی وفات ہو چکی ہے۔ (سیرت ابن ہشام ۴/۳۳۴ خ)

سمجھا جاسکتا ہے کہ یہی حضرت عمرؓ انتہائی جوش اور غضب کے عالم میں کسی بھی طرح چپ ہونے کو تیار نہ تھے؛ لیکن قرآن کی ایک آیت سنتے ہی وہ بالکل ساکت ہو گئے اور یک لخت ہتھم گئے، انتہائی ہیجانی حالات میں بھی قرآن کی ایک آیت سنتے ہی بالکل خاموش ہو جانا، سر تسلیم خم کر دینا اور اپنے جذبات کو زیر کر دینا انسان کی عظمت کا سب سے بلند معیار

و کردار ہوتا ہے، اختلافات کے باوجود عدل کی ڈگر پر قائم رہنا، انا زخمی ہونے کے باوجود تحمل و صبر کی روش اپنائے رکھنا، تحقیر و اہانت کے باوجود انتقام کی نفسیات سے پاک رہنا اور عین اشتعال و جذباتیت کے ماحول میں ضبط اور سکون کی کیفیت برقرار رکھنا انتہائی اعلیٰ و ارفع اوصاف و اخلاق ہیں، صحابہ کی سیرت ان اوصاف کے سیکڑوں مظاہر اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے اور رہتی دنیا تک مشعلِ راہ ہے، اور یہ پیغام دے رہی ہے کہ ان اوصاف کو جب تک مزاج بنانے کی فکر نہیں پیدا ہوگی، عظمت اور فلاح کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔



# مصنف کی مطبوعہ علمی کاوشیں

## ● اسلام میں عفت و عصمت کا مقام

یہ کتاب عفت و عصمت کے موضوع پر انتہائی تفصیلی اور اہم پیش کش ہے، اپنے مندرجات کی جامعیت اور نصوص کی کثرت کی بنیاد پر اپنے موضوع پر اردو زبان میں انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، ملک و بیرون ملک کے اکابر علماء کے تاثرات و تقریظات سے آراستہ ہے۔ مختصر سے عرصہ میں اس کے پانچ ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں، یہ کتاب بجا طور پر اس قابل ہے کہ عوام و خواص، علماء و عوام، مرد و عورت سبھی اس کو اپنے مطالعہ میں رکھیں۔

## ● بیانات سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کتاب موجودہ حالات میں سیرت نبویہ کے فکر انگیز پیغام اور گوشوں کو واضح کرنے والی مکمل، مدلل، مرتب، جامع اور موثر سیرت طیبہ سے متعلق چار مفصل بیانات پر مشتمل ہے، اور قرآن و حدیث کی روشنی میں حسن ترتیب کے ساتھ پوری سیرت کو اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، عوام و خواص ہر ایک کے لئے یکساں طور پر افادیت کی حامل اور قابل مطالعہ ہے۔

## ● اسلام میں صبر کا مقام

یہ کتاب صبر کے موضوع پر ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، فاضل مصنف نے اس کتاب میں جدید اسلوب میں قرآن و حدیث، آثار و صحابہ کی روشنی میں صبر کے مقام، اس کی اہمیت اور ضرورت کے متعدد پہلوؤں کو کافی شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا ہے، صبر و شکر کے تقابلی تجزیے پر مصنف نے بے حد قیمتی باتیں تحریر کی ہیں، دور حاضر کے ہر نوجوان کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

## ● ترجمان الحدیث

اس کتاب میں اصلاح معاشرہ اور تعمیر سیرت و اخلاق کے متعلق ڈیڑھ سو صحیح ترین احادیث نبویہ کی مدلل اور عام فہم اسلوب میں عالمانہ تشریح کی گئی ہے۔ یہ کتاب بجا طور پر اس قابل ہے کہ اپنے مواد کی علمیت اور افادیت کی وجہ سے اسے مساجد اور اجتماعی مجالس میں سنایا اور پڑھایا جائے۔

## ● اسلام کی سب سے جامع عبادت نماز

اس کتاب میں نماز کی اہمیت، اقسام و انواع، خشوع کی شرعی حیثیت، خشوع کے مختلف طریقوں کا ذکر قرآن و سنت کی روشنی میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ خشوع کے موضوع پر جو فاضلانہ اور عالمانہ مفصل و مدلل بحث کی گئی ہے وہ اردو دنیا میں اپنی نوعیت کی منفرد چیز ہے، یہ کتاب ہر خاص و عام کے مطالعہ میں جگہ پانے کی اولین مستحق ہے۔

## ● اسلام اور زمانے کے چیلنج

موجودہ معاصر حالات کے تناظر میں مصنف کے اشیب قلم سے نکلی ہوئی پرسوز، پرورد اور واقعیت پسندی پر مبنی فکری تحریروں کا یہ مجموعہ موجودہ صورت حال میں ہر مسلمان کے لئے راہبر اور فکری غذا فراہم کرتا ہے، جو بات بھی لکھی گئی ہے باحوالہ اور نصوص کی روشنی میں ہے۔

## ● سیرتِ نبویہ قرآن مجید کے آئینے میں

یہ کتاب قرآن کی روشنی میں سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع اور روشن پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، قرآنی سیرت کے موضوع پر یہ اردو زبان میں پہلی باضابطہ کتاب ہے، جس میں سیرت طیبہ کو تاریخی ترتیب کے ساتھ قرآنی بیان کے آئینے میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، اسلوب بیان بے حد پرکشش اور اچھوتا ہے۔ کتاب کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔

## ● عظمتِ عمر کے تابندہ نقوش

یہ کتاب عربی کے مشہور ادیب شیخ علی ططاوی کی پراثر تحریر ”قصۃ حیاۃ عمر“ کی ترجمانی ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمے سے مزین ہے، کتاب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عظمت و عقدریت کے نمایاں پہلو بہت دل نشیں اور ساحرانہ اسلوب میں اجاگر کئے گئے ہیں، سیرتِ عمر پر یہ کتاب عمدہ اور قابل قدر اضافہ ہے۔

## ● گناہوں کی معافی کے طریقے اور تدبیریں

یہ کتاب صحیح ترین احادیثِ نبویہ کی روشنی میں گناہوں کی معافی کے مختلف طریقوں کو محیط ہے، اس میں گناہ گاروں کو مایوسی سے بچنے کی تاکید اور توبہ کی تحریک اور عملِ صالح کی ترغیب ملتی ہے، ہر مسلمان نوجوان کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

## ● گلہائے رنگارنگ

تین جلدوں پر مشتمل یہ موقع کتاب قرآن و سنت کی انقلابی تعلیمات، اصلاحِ قلب و نفس و معاشرہ، اسلام کے خلاف پھیلانے گئے مغالطوں اور شکوک و شبہات کی مکمل اور مدلل تردید کو محیط عام فہم اور دل نشیں اسلوب میں بیش قیمت اور فکر انگیز تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت جلد مقبول ہوا، اب دوسرا ایڈیشن زیر طباعت ہے۔

## ● مفکر اسلام؛ جامع کمالات شخصیت کے چند اہم گوشے

یہ کتاب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ کی حیات و خدمات اور ان کی تابندہ زندگی کے روشن نقوش اور نمایاں امتیازات کی جامع اور مکمل تصویر کشی ہے۔ کتاب حضرت مولانا نظر شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ کے بیش قیمت مقدمات سے مزین ہے، متعدد اہل قلم کے تاثر کے مطابق مفکر اسلام کی شخصیت پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ کتاب اپنے مواد کی جامعیت، اسلوب کی دل کشی اور حسن بیان کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتی ہے۔



## ● علوم القرآن الکریم

یہ کتاب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کی اردو تصنیف علوم القرآن کا عربی ترجمہ ہے۔ مترجم نے بہت سلیس اور شگفتہ عربی زبان میں کتاب کو اردو سے منتقل کیا ہے، شروع میں حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کا مقدمہ زینت کتاب ہے۔

## ● اسلام میں عبادت کا مقام

یہ کتاب عبادت کے موضوع پر انتہائی جامع اور محیط کتاب ہے، جس میں عبادت کے تمام پہلوؤں کا کتاب و سنت اور اقوال سلف کی روشنی میں تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ عوام اور خواص سب کے لئے یکساں مفید ہے۔

## ● اسلام دین فطرت

یہ کتاب مذہب اسلام کے امتیازات اور اس کی انسانیت نواز تعلیمات کو واضح کرتی ہے، اس میں اسلام کی جامعیت، واقفیت، حقیقت پسندی، ربانیت، امن و سلامتی، اخوت و وحدت، مساوات و اجتماعیت جیسے متعدد اہم گوشوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ہر باذوق کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

## ● دیگر کتب:

اختر تاباں (تذکرہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب)

والد ماجد (تذکرہ حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب)

شیخ الہند: حیات، خدمات و امتیازات

مقام صحابہ اور غیر مقلدین

اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روشن عناوین

سچ اور جھوٹ کتاب و سنت کی روشنی میں ایک جائزہ

اسلام کا جامع اور مؤثر ترین تعزیری نظام

کچھ یادیں کچھ باتیں (تذکرہ حضرت مولانا مفتی محمد افضل حسین صاحب)

اسلام اور دہشت گردی

بنیادی دینی اور تاریخی معلومات (اردو، ہندی)

منشیات اور شراب: اسباب و محرکات، شرعی ہدایات، سد باب کی تدبیریں

## ● عربی کتب:

○ وان المساجد لله ○ لمعات من الاعجاز القرآنی البديع

○ اصول المعاش الاسلامی فی ضوء نصوص الكتاب والسنة.....

○ نظرة عابرة على القضاء والقضاة فی الاسلام ○ بحوث علمية فقهية